۲۹ نومبر ۱۹۹۳ء

ندائے خلافت

☆ نیو ورلڈ آرڈر میں پاکستانی فوج کا کردار کیا ہو گا؟

☆ صدر وزیر اعظم کشمکش نصف صدی کا قصہ ہے

☆ تہذیب مغرب ہی دراصل عورتوں کے حقوق کی قاتل ہے

یہ مذہبی فرقوں کی نمائندہ جماعتیں!

۱۹۹۳ء کے الیکشن پایہ تکمیل کو پہنچے اور ساتھ ہی اس الیکشن میں حصہ لینے والی درجنوں مذہبی سیاسی جماعتیں بھی انجام کو پہنچ گئیں۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔ ایسی جماعتوں کی کامیابی کا تو کسی کو یقین تھا ہی نہیں۔ لیکن ان کا جو حشر ہوا وہ قابل عبرت ضرور ہے۔

یہ جماعتیں 'دین اسلام کی نہیں بلکہ مذہبی فرقوں کی نمائندہ جماعتیں ہیں۔ فرقہ پرستی کی بنیاد پر جو مولوی سرمایہ دار بن گئے وہ سیاسی لیڈر بھی بن گئے۔ ان مذہبی سیاسی لیڈروں کی بقاہی مسلمانوں کی تقسیم اور فرقہ پرستی میں ہے۔ ان کا کسی اسلامی تحریک سے کیا واسطہ۔ اسلام تو ایک وحدت ہے مگر یہ مذہبی لیڈر اپنی اپنی گدیاں سجائے بیٹھے ہیں۔ امت میں وحدت پیدا کئے بغیر رب کی دھرتی پر رب کا نظام قائم کرنے کے لئے جہاد اتنا آسان نہیں۔

الیکشن ۱۹۹۳ء کا ملک اور قوم کو اور کچھ فائدہ تو نہ ہوا۔ البتہ اس دیس کے مسلمانوں نے فرقہ پرست مولویوں کو رد کر کے اسلامی تحریک کے لئے راستہ صاف کر دیا۔ یہ الیکشن اسلام اور کفر کے مقابلے کے لئے منعقد نہیں ہوا۔ بلکہ اقتدار کے لئے دو ایسی پارٹیوں کے درمیان تھا جو ایک ہی لادینی نظام کو قائم رکھنا چاہتے ہیں۔ یہ پورا نظام جو اس ملک میں نافذ العمل ہے اسلامی روح اور تعلیمات کے خلاف ہے۔ یہ ظلم و جبر کا نظام ہے۔ پوری انسانی تاریخ میں آج تک کسی بھی ظلم و جبر کے نظام کو الیکشن کے ذریعے ختم نہیں کیا گیا۔ اب وقت آ گیا ہے اور دنیا کے ہر گوشے میں مسلمان بیدار ہو رہے ہیں۔ مغرب کے نظام سیاست' معاشرت اور معیشت سے مسلمانوں کو آزادی دلوانے کے لئے جہاد کی تیاری میں مصروف ہیں۔ ہزاروں لاکھوں مسلمان اس وطن عزیز میں رب کی دھرتی پر رب کے نظام کے قیام کے لئے جہاد کے پہلے مرحلے میں داخل ہو چکے ہیں اور آگے بڑھ رہے ہیں۔ کامیابی کے وقت کا تعین اللہ کے ہاتھ میں ہے۔

(بشکریہ [illegible])

صدارتی نظام خلافت راشدہ کے نظام سے زیادہ قرب رکھتا ہے

لاہور ۱۲ / نومبر۔ امیر تنظیم اسلامی و داعی تحریک خلافت پاکستان' ڈاکٹر اسرار احمد نے کہا ہے کہ کل ہونے والا صدارتی الیکشن موجودہ حالات میں بہت اہمیت اختیار کر گیا ہے کیونکہ ایک رسمی عہدے کو آٹھویں ترمیم کے ذریعے حاصل شدہ صوابدیدی اختیارات نے رائج الوقت نظام حکومت میں کلیدی حیثیت دے دی ہے۔ مسجد دارالسلام باغ جناح میں اپنے خطاب جمعہ کے موضوع اسلامی ریاست کی ہیئت ترکیبی پر تمہیدی گفتگو کرتے ہوئے انہوں نے کہا کہ اگرچہ موجودہ پارلیمانی نظام بھی خلاف اسلام تو نہیں تاہم خلافت راشدہ کا حکومتی ڈھانچہ آج کے صدارتی نظام سے قریب تر تھا بلکہ زیادہ صحیح بات یہ ہے کہ وہ صدارتی وحدانی طرز حکومت تھا جبکہ پاکستان کے لئے نظام خلافت کو جدید ترقی یافتہ علوم سیاست و حکومت کی مدد سے صدارتی وفاقی سانچے میں ڈھالنا ضروری ہوگا۔ ڈاکٹر اسرار احمد نے کہا کہ پچھلے دنوں میاں نواز شریف صاحب نے صدارتی نظام کے حق میں آواز اٹھائی تھی۔ اب وہ تو شاید اس لئے چپ ہو بیٹھے کہ ان کا تعلق سب سے بڑے صوبے پنجاب سے ہے اور وہ چھوٹے صوبوں کی ناخوشی مول نہیں لینا چاہتے لیکن صحافتی حلقوں میں ایک بحث کا آغاز ہو گیا ہے۔ انہوں نے یاد دلایا کہ وہ بہت پہلے سے صدارتی نظام کی وکالت کر رہے ہیں کیونکہ پارلیمانی نظام میں ایک خوبی تو ہے کہ کرکٹ کے کھیل کی طرح طرز حکومت کا یہ گورکھ دھندا بھی انگریز کی وراثت ہے ورنہ اس کے علاوہ ہمارے لئے اس میں کوئی اور دلکشی نہیں پائی جاتی۔ ڈاکٹر اسرار احمد نے کہا کہ چھوٹے صوبوں کو خوف ہے کہ اپنی آبادی کی غالب اکثریت کے بل پر پنجاب صدارتی نظام میں حکومت کا پٹہ اپنے نام لکھوا لے گا تو اس کا توڑ یہ ہے کہ صوبوں کی موجودہ حد بندی ختم کر کے نئے چھوٹے صوبے بنائے جائیں اور نئے صوبوں کی تشکیل میں زبان اور تہذیب و تمدن کا بھی لحاظ رکھ لیا جائے تو یہ کوئی برائی نہیں بھلائی ہوگی۔ انہوں نے کہا کہ یہ صوبے آسمان سے نازل نہیں ہوئے بلکہ انگریز نے اپنی انتظامی سہولت کے لئے یہ حدود قائم کی تھیں جنہیں اب ہم نے تقدس کا درجہ دے دیا ہے۔

ڈاکٹر اسرار احمد نے کہا کہ پارلیمانی نظام انگریز کی مجبوری ہے کہ وہ روائت پرست ہے اور اپنے بادشاہ یا ملکہ کی روائت کو برقرار رکھنا چاہتا ہے چاہے قصر بکنگھم کی حیثیت چڑیا گھر جیسی ایک سیرگاہ کی ہی کیوں نہ رہ گئی ہو لیکن ہمیں ایسی کوئی مجبوری لاحق نہیں۔ آخر ہم دنیا کی سب سے زیادہ ترقی یافتہ قوم یعنی امریکہ سے اس کا صدارتی نظام کیوں نہ مستعار لیں جس میں مقننہ' انتظامیہ اور عدلیہ کو بڑی خوبی سے جدا جدا رکھا جا سکتا ہے جبکہ پارلیمانی نظام میں نظری طور پر چاہے کوئی بھی دعوٰی کیا جائے' ان قومی امور کو گڈمڈ ہونے سے نہیں بچایا جا سکتا اور پاکستان کی نصف صدی کی تاریخ اس پر گواہ ہے۔ انہوں نے کہا کہ سربراہ مملکت اور سربراہ حکومت کی دوئی کا سیاسی شرک روا رکھتے ہوئے ہم ایک طرف تو ایک آرائشی عہدے پر غریب قوم کا کروڑوں روپیہ خرچ کرتے ہیں اور دوسری طرف توازن اختیار کی ایک مستقل پیچیدگی کو جنم دے بیٹھے ہیں جسے ٹھیک جگہ رکھنا شاید ممکن نہیں کیونکہ ہمیں صدر فضل الٰہی اور صدر غلام اسحاق میں سے کوئی بھی پسند نہ آیا۔ ڈاکٹر اسرار احمد نے کہا کہ صدارتی نظام کا ایک اور فائدہ وزارتوں کے لئے اہل اور ماہر افراد کے انتخاب کا موقع ہے جو پارلیمانی نظام میں ممکن نہیں۔ ترقی یافتہ معاشروں میں بھی ایسے لوگوں کا الیکشن میں حصہ لینے پر آمادہ ہونا اور پھر کامیابی بھی حاصل کرنا شاید ہی ممکن ہو جو قومی معاملات چلانے کی حقیقی استعداد اور قابلیت رکھتے ہوں جبکہ ہمارے ملک میں تو جوہر قابل الیکشن کے میدان میں اترنے کی سوچ بھی نہیں سکتا۔

خواتین کی مخصوص نشستیں غیر ضروری ہیں

ایک اسلامی ریاست میں قانون سازی میں غیر مسلموں کی شرکت چہ معنی دارد؟

لاہور۔ ۱۹ نومبر۔ امیر تنظیم اسلامی و داعی تحریک خلافت پاکستان ڈاکٹر اسرار احمد نے قومی اسمبلی میں خواتین کی اضافی نشستوں کو غیر ضروری قرار دیتے ہوئے کہا ہے کہ آئین کی رو سے جب کہ خواتین کو عام انتخابات میں بطور امیدوار حصہ لینے کی اسی طرح آزادی ہے جیسی کہ مردوں کو حاصل ہے تو ان کے لئے اضافی نشستوں کا قطعاً کوئی جواز نہیں۔ انہوں نے اس امر پر حیرت کا اظہار کیا کہ اسمبلی کے مرد ممبران کے ووٹوں سے کامیاب ہونے والی خواتین کو عورتوں کی نمائندگی کیسے حاصل ہو جائیگی؟ اور اگر یہ ایسا ہی ضروری ہے تو جیسا کہ نواز شریف صاحب نے تجویز پیش کی ہے خواتین کے لئے عام انتخابات کرائے جائیں۔ اس طرح اگر حلقے بڑے بنانے پڑتے ہیں تو اقلیتوں کے لئے بھی تو آخر بڑے ہی حلقے ہوتے ہیں۔ تاہم نواز شریف صاحب کو اس طرح کے معاملات میں گومگو کی پالیسی ترک کر کے واضح اور دو ٹوک موقف اختیار کرنا چاہئے۔ کھلے سیکولرزم کے مقابلے میں اسلام کے ساتھ عملی وابستگی اور اصولوں پر مبنی سیاست سے ہی ان کی حیثیت مضبوط ہوگی۔ چند گنی چنی مغرب کی دلدادہ خواتین کی نازبرداری کی بجائے ضرورت ان خواتین کے حقوق پر توجہ دینے کی ہے جو فی الواقع پسماندگی کا شکار ہیں مگر ان کی عظیم اکثریت اب بھی اسلام سے اپنا تعلق جوڑتی ہے۔

مسجد دارالسلام' باغ جناح میں نماز جمعہ سے قبل اپنے خطاب میں اسلامی ریاست میں غیر مسلموں کے حقوق پر روشنی ڈالتے ہوئے ڈاکٹر اسرار احمد نے کہا کہ ان کی جان و مال' عزت و آبرو' عقیدہ' عبادت گاہوں اور پرسنل لاء کی پوری حفاظت اسلامی ریاست کی ذمہ داری ہے۔ اس لحاظ سے انہیں برابر کے شہری حقوق حاصل ہیں لیکن قانون سازی میں ان کی شرکت بے

تاخلافت کی بنا دنیا میں ہو پھر استوار
لا کہیں سے ڈھونڈ کر اسلاف کا قلب و جگر

تحریکِ خلافت پاکستان کا نقیب

ہفت روزہ
ندائے خلافت
لاہور

جلد ۲ شمارہ ۴۷
۲۹ نومبر ۱۹۹۳ء

21

مدیر
اقتدار احمد

معاون مدیر
حافظ عاکف سعید

یکے از مطبوعات
تنظیمِ اسلامی

مرکزی دفتر: ۶۷۔اے، علامہ اقبال روڈ، گڑھی شاہو، لاہور

مقامِ اشاعت
۳۶۔کے، ماڈل ٹاؤن، لاہور
فون: ۸۵۶۰۰۳

پبلشر: اقتدار احمد طابع: رشید احمد چودھری
مطبع مکتبہ جدید پریس ریلوے روڈ لاہور

قیمت فی پرچہ: ۵/- روپے
سالانہ زرِ تعاون (اندرون پاکستان) ۱۰۰/- روپے

زرِ تعاون برائے بیرون پاکستان
سعودی عرب، متحدہ عرب امارات، بھارت ——— ۱۰ امریکی ڈالر
مسقط، عمان، بنگلہ دیش ——— ۸ " "
افریقہ، ایشیا، یورپ ——— ۱۲ " "
شمالی امریکہ، آسٹریلیا ——— ۱۴ " "

ایڈیٹر کے ڈیسک سے!

"ندائے خلافت" کا زیرِ نظر شمارہ بھی بعض سابق شماروں کی مانند متنوع مضامین کا حامل ہے۔ انتخابات اور ان کے نتائج پر تبصرے سے متعلق مضامین کی اشاعت کے بارے میں اگرچہ اپنے طور پر ہم یہ فیصلہ کر چکے تھے کہ اس سلسلے کو اب موقوف کر دیا جائے لیکن اس موضوع پر ہمارے قارئین کے مضامین اس کثرت سے آ رہے ہیں کہ ہمیں اپنے فیصلہ پر نظرِ ثانی کی ضرورت محسوس ہوئی۔ چنانچہ اس نوعیت کا ایک مضمون شاملِ شمارہ کیا گیا ہے۔

عبدالکریم عابد صاحب نے اس بار اپنے تجزیئے میں پاکستان کے حالات کا بین الاقوامی تناظر میں جائزہ پیش کیا ہے۔ نیو ورلڈ آرڈر میں پاکستانی افواج کو امریکہ اپنے مقاصد کے لئے کس طرح استعمال کر رہا ہے' آئندہ اس ضمن میں امریکہ کے کیا عزائم ہیں' مسئلہ کشمیر کا اونٹ کس کروٹ بیٹھتا دکھائی دیتا ہے' بے نظیر کا اقتدار کامل ہونے کے کیا نتائج ظاہر ہوں گے' ان موضوعات پر عابد صاحب کا تجزیہ نہایت وقیع اور فکر انگیز ہے۔

داعی تحریک خلافت جناب ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کے نام سابق امیر جماعت اسلامی میاں طفیل محمد صاحب کا خط جو پہلے "نوائے وقت" میں اور ازاں بعد "زندگی" میں شائع ہوا' ہم نے بھی من و عن زیرِ نظر شمارے میں شائع کر دیا ہے اور ساتھ ہی جناب نثار ملک کا تحریر کردہ جواب بھی' جو حقیقت حال کی وضاحت کے لئے کافی ہے۔ ہمیں حیرت اور افسوس اس بات پر ہے کہ جماعت کی سابقہ اور موجودہ قیادت اپنی اصل غلطی پر متنبہ ہونے کو تیار نہیں ہے۔ وہ دانستہ یا نادانستہ اس سے نظریں چرانے کی پالیسی کو اپنائے ہوئے ہے۔ جماعت کے قائدین بعض سطحی اور وقتی اسباب کو اپنی شکست کا موجب ٹھہرا کر جماعت کی مجموعی پالیسی پر مطمئن اور قانع ہو کر بیٹھ رہے ہیں۔ وہ یہ ماننے کو تیار نہیں کہ قیام پاکستان کے بعد انتخابی سیاست کے میدان میں کودنے کا فیصلہ غلط تھا' حالانکہ حالیہ الیکشن کے نتائج سامنے آنے کے بعد تو یہ حقیقت کسی عام انسان سے بھی مخفی نہیں رہی۔ ڈاکٹر طاہر القادری صاحب اس پہلو سے لائق تعریف ہیں کہ انہوں نے ایک ہی الیکشن سے وہ سبق سیکھ لیا جو جماعت چالیس برس میں نہ سیکھ سکی اور حالیہ الیکشن سے نہ سیکھ سکی تو اندیشہ ہے کہ کبھی نہ سیکھ سکے گی۔ تاہم ڈاکٹر قادری صاحب نے مصطفوی انقلاب کا جو راستہ تجویز کیا ہے وہ ہرگز انقلابی تقاضوں سے ہم آہنگ دکھائی نہیں دیتا۔ قارئین کی دلچسپی کے لئے ہم نے قادری صاحب کا وہ تازہ مضمون بھی شمارے میں شامل کر دیا ہے جس میں انہوں نے اپنے آئندہ لائحہ عمل کے خدوخال بیان کئے ہیں تاکہ قارئین خود اسے پڑھ کر رائے بنائیں کہ کیا اس راستے سے انقلاب کی توقع کی جا سکتی ہے!۔

قومی اسمبلی میں خواتین کی مخصوص نشستوں کے حوالے سے خواتین کے حقوق کا موضوع آج کل زبان زد خاص و عام ہے۔ اس ضمن میں محمد سمیع نے اپنے مضمون میں حقیقت پسندانہ تجزیہ پیش کیا ہے کہ اصل ضرورت اس بات کی ہے کہ مغرب کی اندھی نقالی کی بجائے خواتین کے مسائل کو سمجھ کر ان کے حل کی جانب پیش رفت کی کوشش کی جائے۔ جو حقوق انہیں اسلام نے دیئے ہیں وہ کوئی اور نظام نہیں دے سکتا۔ سمیع صاحب نے بڑی عمدگی سے یہ ثابت کیا ہے کہ تہذیب مغرب ہی دراصل خواتین کے حقوق کی قاتل ہے۔ OO

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الہدیٰ

حافظ عاکف سعید

اللہ کی تسبیح کرتی ہے ہر وہ شے جو آسمانوں میں ہے اور ہر وہ شے جو زمین میں ہے اور وہ زبردست ہے حکمت والا O

(کہ بعید نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے زمین و آسمان میں موجود ہر شے کو کسی نہ کسی انداز کی قوت گویائی عطا کی ہو اور ہر شے اپنی زبان سے اللہ کی تسبیح و تحمید میں اس طور سے مشغول ہو جسے ہم سمجھنے سے قاصر ہوں' لیکن تمام موجودات کی' خواہ وہ انسانوں کے قبیل سے ہوں یا حیوانات کی صنف سے اور خواہ وہ نباتات کے زمرے میں آتے ہوں یا جمادات کے' ایک تسبیح وہ ہے جسے ہم بخوبی سمجھ سکتے ہیں کہ ہر شے زبان حال سے اپنے خالق و مالک اور اپنے مصور و موجد کے کمال فن اور قدرت کاملہ کا اعلانیہ اعتراف و اقرار کر رہی ہے کہ مجھے بنانے والی اور میری تصویر کشی کرنے والی ذات ہر عیب' ہر نقص اور ہر کوتاہی سے پاک اور ہر خامی اور ہر کمی سے منزہ و مبرا ہے..... اور وہ پروردگار اور رب کائنات غالب و حاکم بھی ہے اور دانا و حکیم بھی)

اے ایمان والو' تم وہ بات کہتے کیوں ہو جو کرتے نہیں! بڑی بیزاری کی بات ہے اللہ کے نزدیک کہ تم کہو وہ بات جو کرتے نہیں O

(کہ ایمان کے وہ دعویدار جو جہاد سے جی چراتے ہیں' جو زبانی طور پر اللہ اور اس کے رسول کی محبت کا دم بھرنے میں تو کسی سے پیچھے نہیں لیکن جب دین کی طرف سے جان و مال کے خرچ کا مطالبہ سامنے آتا ہے تو دامن بچانے کی فکر کرتے ہیں' درحقیقت قول و فعل کے تضاد کا شکار ہیں۔ وہ زبان سے جس بات کا اقرار کرتے ہیں اس کے عملی تقاضوں کو پورا کرنے کے لئے آمادۂ کار نہیں ہوتے۔ قول و عمل کا یہ تضاد اللہ کے نزدیک انتہائی ناپسندیدہ ہی نہیں بیزار کن بھی ہے اور جس کسی سے اللہ تعالیٰ بیزاری کا اعلان فرمادیں' اس کے لئے کوئی ٹھکانہ ہے نہ جائے پناہ)

اللہ تو ان لوگوں کو محبوب رکھتا ہے جو اس کی راہ میں صف بستہ ہو کر اس طرح لڑتے ہیں گویا وہ ایک سیسہ پلائی ہوئی دیوار ہوں O

(ہاں اللہ کو محبت تو ان لوگوں سے ہے جو ہر چہ باداباد کی کیفیت کے ساتھ دین کے ہر تقاضے پر لبیک کہتے ہیں۔ وہ جمادات و نباتات کی طرح شب و روز اللہ کی تسبیح ہی میں مشغول نہیں رہتے بلکہ اللہ کے دین کی سربلندی اور سرفرازی کے لئے باطل سے پنجہ آزمائی بھی کرتے ہیں اور اس جدوجہد میں جان ہتھیلی پر رکھ کر میدان جنگ میں آنا پڑے تو اس سے بھی دریغ نہیں کرتے بلکہ پوری جوانمردی' ہمت اور استقامت کے ساتھ اللہ کی راہ میں قتال کرتے ہیں--- اور اللہ کے کلمے کی سربلندی کی اس جدوجہد میں جان سے گزر جانے کو اپنی سب سے بڑی خوش بختی تصور کرتے ہیں۔)

شہادت ہے مطلوب و مقصود مومن نہ مال غنیمت نہ کشور کشائی

(سورۃ الصف' آیات ایک تا تین)

جوامع الکلم

دین کا سر آغاز اسلام ہے اور دین کا عمود نماز ہے اور اس کی چوٹی ہے جہاد فی سبیل اللہ

(ایک انسان زبان سے کلمہ طیبہ ادا کر کے دائرہ اسلام میں داخل ہوتا ہے۔ گویا اللہ اور اس کے رسول کے سامنے اپنا سر اطاعت خم کر دیتا ہے۔ اسی کا نام اسلام ہے جو دین کے لئے جڑ اور بنیاد کی حیثیت رکھتا ہے۔ اور نماز بلاشبہ وہ عمود اور کھونٹا ہے جسے دین میں مرکزی مقام حاصل ہے اور جس سے ایک مسلمان کے تمام دیگر معمولات بندھے رہتے ہیں اور دین میں چوٹی کا عمل جہاد فی سبیل اللہ ہے جس کے بغیر دین اسی طرح نامکمل اور ناتمام رہتا ہے جیسے وہ ٹنڈ منڈ درخت جس کی چوٹی کاٹ دی گئی ہو!)

(جامع ترمذی بروایت حضرت معاذ بن جبلؓ)

بے نظیر حکومت...... کامل اقتدار کی جانب سفر

نیو ورلڈ آرڈر میں پاکستانی فوج کا کردار ہو گا

کیا امریکہ پاکستان کے بارے میں اپنے عزائم کی تکمیل کر سکے گا؟

عبدالکریم عابد

پاکستان کا سیاسی منظر تبدیل ہو گیا ہے۔ پیپلزپارٹی مرکز میں برسراقتدار ہے، سب سے بڑے صوبہ پنجاب میں برسراقتدار ہے اور اس سے بھی زیادہ اہم بات یہ ہے کہ صدر کا طاقتور منصب بھی اس کے ہاتھ میں ہے۔ اور یہ پہلا موقع ہے کہ پاکستان کی تاریخ میں ایسا صدر آیا ہے جو اسٹابلشمنٹ کا اپنا آدمی نہیں ہے۔ اور صدر کے خصوصی اختیار سے دستبردار ہونے کے لئے بے چین ہے تاکہ پارلیمنٹ صحیح معنوں میں مقتدر اعلیٰ ہو سکے۔ یہ ساری تبدیلی امریکہ کو مطمئن کرنے کے لئے کی گئی ہے۔ اور وزیر خارجہ بھی امریکی پسندیدگی کو پیش نظر رکھ کر بنایا گیا ہے۔ اس سے پہلے نگران وزیراعظم معین قریشی بھی امریکی پسند کے مطابق امریکی عالمی مالیاتی اداروں کے ایجنڈے کی تکمیل کے لئے لائے گئے تھے۔ اور اس سے پاکسان کی اقتصادی امداد بحال ہو گئی ہے۔ اب باقی امور میں امریکی ایجنڈے کی تکمیل ہو گی۔ اس کے عوض فوج کی ضروریات کے فاضل پرزے ملیں گے۔ ایف ایک سو چار طیاروں میں جو پیسہ ہم نے پھنسا رکھا ہے اس کا کچھ تصفیہ ہو گا۔ طیارے ملنے کی قوی امید ہے۔ کشمیر کے سلسلہ میں امریکہ نے پہلے ہی یہ کہ کر ہمارا جی خوش کر دیا ہے کہ وہ اسے متنازعہ علاقہ مانتا ہے۔ اور مسئلہ کشمیر کے حل کے لئے بھارت پر دباؤ بھی نظر آ رہا ہے۔ پرسلر ترمیم کی رکاوٹوں کو دور کرنے پر امریکہ میں سنجیدگی سے کوشش ہو رہی ہے اور ایٹمی مسئلہ پر پاکستان کے اس موقف کو بہتر طور پر سمجھا جا رہا ہے کہ اصل دباؤ بھارت پر ہونا چاہئے تاکہ وہ پاکستان کے ساتھ مل کر این پی ٹی معاہدہ پر دستخط کرے۔

حقیقت یہ ہے کہ ہمارا اسٹابلشمنٹ امریکہ سے ٹکراؤ کا متحمل نہ کبھی ہوا ہے نہ کبھی ہو سکتا ہے۔ کچھ رو و رعایت ہمارے ساتھ افغان جنگ کے دوران ہوتی رہی ہے۔ اس عرصہ میں ایٹمی مسئلہ پر رویہ سخت نہیں رہا اور امریکی صدر ہر سال یہ سرٹیفکیٹ جاری کرتے رہے کہ پاکستان کا ایٹمی چال چلن ٹھیک ٹھاک ہے اور اس سرٹیفکیٹ کی بنیاد پر ہمیں امداد ملتی رہی۔ لیکن افغان جنگ کے ختم ہوتے ہی امریکی صدر نے اس طرح کے سرٹیفکیٹ جاری کرنے سے انکار کر دیا اور پاک امریکی تعلقات میں بحران پیدا ہوا۔ بحران کو ضیاء الحق کے طیارہ کے حادثہ کے ذریعہ دور کرنے کی کوشش کی گئی اور خیال کیا گیا کہ فوجی قیادت کی تبدیلی کے بعد بحران ختم ہو جائے گا۔ لیکن یہ باقی رہا اور اس درجہ باقی رہا کہ جنرل اسلم بیگ نے پاکستانی فوج کے سربراہ ہونے کے باوجود خلیجی جنگ کے سلسلہ میں امریکہ کے خلاف بیانات دیئے۔ مگر یہ بیان بھی فوج کی ناراضگی ظاہر کرنے کے لئے تھا۔ امریکہ کی حکم عدولی کے لئے نہیں تھا۔ اور عملاً خلیج میں وہی پالیسی رکھی گئی جو امریکہ چاہتا تھا۔ اسلم بیگ کے بعد فوج اور امریکہ کے تعلقات کے بگاڑ کو دور کرنے کے لئے جنرل آصف نواز نے کوشش کی۔ انہوں نے اس غرض کے لئے بے نظیر صاحبہ کو بھی امریکہ بھیجا اور اشارہ دیا کہ پاکستانی فوج پیپلزپارٹی اور بے نظیر کو اپنانے کے لئے تیار ہے۔

آصف نواز تو اچانک منظر سے غائب ہو گئے۔ لیکن ان کی پالیسی زیادہ زور و شور کے ساتھ آگے بڑھی۔ اس کے نتیجہ میں نواز شریف صاحب کو رخصت ہونا پڑا اور بے نظیر صاحبہ کی آمد کے بعد اقتدار مکمل طور پر پیپلزپارٹی کے ہاتھوں میں دے دیا گیا ہے۔ سرحد بلوچستان میں بھی پارٹی کے حسب منشا تبدیلی ہو جائے گی اور پیپلزپارٹی کا اقتدار مزید پائیداری حاصل کرے گا۔ بلدیاتی انتخابات میں بھی وہ اپنی طاقت میں اور اضافہ کرے گی۔ جاگیردار طبقہ پہلے ہی حکومت کے ساتھ ہے جو دیہاتوں پر کنٹرول رکھتا ہے۔ البتہ شہروں میں اس کی حیثیت کافی کمزور ہے۔ صنعتی و تجارتی طبقہ میں وہ ناپسندیدہ ہے۔ لیکن پارٹی کے پاس اقتدار ہے اور اقتدار کے بل بوتے پر وہ شہروں میں بھی طاقت بنانے میں کچھ نہ کچھ کامیاب رہے گی۔ اور تاجر صنعت کار طبقہ سے بھی سمجھوتے کر کے انہیں سیاسی لڑائی میں غیر جانبدار رہنے کی ترغیب دی۔

وہ بیوروکریسی میں بھی حسب منشا تبدیلیاں کر رہی ہیں اور یہ تبدیلیاں سول شعبہ تک محدود نہیں رہینگی۔ فوج بھی ان تبدیلیوں کی زد میں آئے گی اور وہاں بھی پرانے ذہن اور مزاج کے بہت سے لوگ ریٹائرمنٹ کے قریب ہیں۔ اور فوج کی صفوں میں بھی کافی ردوبدل ہو گا۔ اور یہ بھی پیپلزپارٹی اپنے مفاد کے مطابق کریگی۔ بھٹو صاحب کو جب فوج چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر بنا کر لائی تھی تو انہوں نے اپنے پرانے مہربانوں کو باقی نہیں رہنے دیا تھا۔ ان سب کو چلتا کیا تھا اور نئے لوگ آگے کئے تھے۔ اب بھی بے نظیر صاحبہ سمجھیں گی کہ یہی موقع ہے۔ اس وقت امریکہ ان کی پشت پر ہے اور فوج بھی امریکہ سے دب رہی ہے۔ اس لئے حسب منشا ادل بدل کرنے کا یہ موقع ہاتھ سے نہیں جانا چاہئے۔ خود امریکہ بھی بے نظیر سے یہی کہے گا کہ وہ فوج کے اندر بھی تبدیلیاں لے آئے۔ اور فاروق لغاری کے صدر بننے سے یہ کام ممکن ہو گیا ہے۔ اس طرح ملک میں پیپلزپارٹی حتمی اقتدار حاصل کرنے کی پوری کوشش کرے گی۔ اور یہ اقتدار اسے حاصل ہو جائے تو اس میں حیرت کی کوئی بات بھی نہیں ہو گی۔ کیونکہ امریکی ایجنڈا یہی ہے۔

پاکستانی فوج نے ان نئے حالات کو کئی وجوہات کی بنا پر قبول کیا ہے۔ ایک تو یہ ہے کہ ساری دنیا میں ہی جمہوریت کو ایک مسلمہ حیثیت حاصل ہو گئی ہے۔ مغربی ممالک نے اپنا وزن اس جمہوریت کے پلڑے میں ڈال دیا ہے۔ انہیں فوجی آمریت پالنے کی ضرورت نہیں رہی ہے۔ جو تبدیلیاں وہ لانا چاہتے ہیں اس کے لئے راستہ جمہوریت ہی سے نکلے گا۔ امریکی دباؤ سے قطع نظر ملکی رائے عامہ بھی اب کسی فوجی آمریت یا نیم جمہوری' نیم آمرانہ نظام کو برداشت کرنے کے لئے تیار نہیں ہے۔ اور اس کی کوشش خود فوج کے وجود کے لئے تباہ کن ہو سکتی ہے۔ پھر یہ کہ کشمیر کا مسئلہ ہم اپنی طاقت کے ذریعہ حل نہیں کرسکتے۔ اس کے لئے ہم امریکہ اور یورپی ممالک کی طرف دیکھتے ہیں۔ اقتصادی طور پر بھی ہمارے پاس اپنے پیروں پر کھڑے ہونے کے نہ حالات ہیں نہ منصوبہ بندی ہے۔ اس لئے امداد کی خاطر ہمارا ہاتھ ہمیشہ پھیلا رہے گا۔

اندرونی طور پر بھی ہمارے درمیان نہ اتحاد ہے' نہ اسلام ہے' نہ وطنیت ہے' نہ قومیت ہے۔ ہر طرح کے تضادات کام کر رہے ہیں۔ اور امریکہ کے سامنے اکڑ خوں دکھائیں گے تو وہ ان تضادات کے ٹکراؤ کی رفتار کو تیز تر کر دے گا۔ ہمارے سر پر بھارت کی طرح کا دشمن کھڑا ہے' جو مسلل موقع کی تاک میں ہے کہ اسے مغرب کی آشیر واد ملے تو وہ پاکستان کا خاتمہ کردے۔ ان حالات میں سیاسی سٹیج پر جوشیلہ مقرر کو امریکہ کے خلاف تقریریں کرسکتے ہیں۔ مگر جی ایچ کوی میں امریکہ کے خلاف منصوبہ بندی اور امریکہ سے ٹکراؤ مول لینے کی پالیسی کو اپنانے کے لئے کوئی تیار نہیں ہے۔ یہ تو وہ پالیسی ہے جس میں خطرات ہی خطرات ہیں۔ اور اس میں کامیابی کے لئے ایک بڑے جنرل سے لے کر عام رکشہ ڈرائیور تک سب کو اپنے پیٹ پر پتھر باندھنا ہو گا اور مصیبتوں کو گلے لگانا سیکھنا ہو گا۔ اس کے لئے ہم میں سے کوئی بھی طبقہ تیار نہیں ہے۔ اس پالیسی کی طرف باتیں ہو سکتیں ہیں اس پر عمل نہیں ہو سکتا۔ عمل جس پالیسی پر ہونا ہے وہ سب سے سامنے آگئی ہے۔

اس میں ہماری فوج کے لئے اطمینان کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ نیو ورلڈ آرڈر کو بھی تربیت یافتہ' ڈسپلن کی پابندی اور جانی قربانی دینے والی فوج کی ضرورت ہوگی۔ امریکی فوجی ہی نہیں سیاستدان بھی موت سے گھبراتے ہیں۔ وہ اس کے لئے تیار نہیں کہ ان کے ملک میں نعشیں آئیں۔ پہلے بھی جب یورپی سامراجوں نے ایشیا افریقہ کو فتح کرنے کا منصوبہ بنایا تھا تو بنیادی پالیسی یہ وضع کی گئی تھی کہ ان ملکوں کو انہیں ملکوں کے ادمیوں کے ذریعے فتح کرو۔ اس غرض کے لئے کرایہ کی فوج ہر جگہ ملتی تھی۔ انگریز نے ہندوستانی سپاہیوں کو لے کر ہی ہندوستان فتح کیا۔ اور پھر ان سپاہیوں کو باضابطہ فوج بنایا' انہیں اعلیٰ تربیت دی' ان میں ڈسپلن پیدا کیا' ان کی وفاداری حاصل کی اور اسی کی بنیاد پر اس نے دو بڑی عالمی جنگیں لڑیں اور ان میں فتح حاصل کی۔ اور ہندوستان چھوڑتے وقت برطانیہ کے لئے سب سے برا مسئلہ یہ تھا کہ جو شاندار فوج ہم نے پیدا کی ہے اس کا کیا ہو گا۔ وہ برباد نہ ہوجائے۔ اس لئے ان کی مشترکہ کمان کی تجویز بھی رکھی گئی جو نہیں مانی گئی۔ تاہم پاکستانی فوج کو اپنے دفاعی معاہدوں میں شریک کرکے اور اسے ملک پر مقتدر اعلیٰ بناکر اس فوج کی برتری قائم کی گئی۔ اب یہی فوج انہیں نیو ورلڈ آرڈر کے لئے بھی مطلوب ہوگی۔

کمبوڈیا' صومالیہ اور خلیج میں اس فوج نے اپنی جاں باری' اپنے ڈسپلن اور اپنی سخت کوشی کا اچھا مظاہرہ کیا ہے۔ ان خصوصیات کے اعتبار سے اس کی ٹکر کی فوج دنیا میں بہت کم ہے۔ اور اسے نیو ورلڈ آرڈر کے لئے ایک قیمتی اثاثہ سمجھا جائے گا اور اہم ذمہ داریاں دی جائینگی۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ بھارت کی طرح پاکستانی فوج کے سامراجی عزائم نہیں ہیں۔ وہ ایک خالص پیشہ ور فوج ہے۔ اپنی اعلیٰ کمان کی ہدایات پر آنکھ بند کر کے عمل کرتی ہے۔ سیاسی شور و شغف سے متاثر نہیں ہوتی۔ اس لئے یہ سمجھنا کہ ایسی شاندار فوج کا ڈر ختم ہو گیا ہے غلط ہے۔ اس کا ڈر نئے آرڈر میں سمویا جائے گا۔ اور اس کے تحت اس فوج کو کافی مالی مفادات بھی حاصل ہونگے۔ خلیج میں اس کی ضرورت عنقریب ہوگی۔ افریقہ میں کئی ملک ایسے ہیں جہاں اس کو ذمہ داریاں تفویض کی جائنگی۔ وسط ایشیا میں بھی اس کے لئے کردار ہو گا اور ہمارے شاہینوں کی نظر اس نئی دنیا کے آسمان پر ہے۔ مگر اس کے لئے انہیں ملکی سیاست میں قائدانہ مقام سے دستبردار ہونا پڑے گا۔ اور جو پارٹی امریکہ کو پسند ہے اسے اقتدار دینا ہو گا۔ اور وہ یہ کام کچھ کرچکے ہیں۔ جو باقی رہ گیا ہے وہ بھی کر دیں گے۔ اس کے انعام کی پہلی قسط میں وہ مسئلہ کشمیر کا حل چاہتے ہیں۔ بھارت تو کسی حل کو ماننے کے لئے تیار نہیں ہے۔ اس کی ہٹ دھری قائم ہے۔ مگر ہمارے پاس ایک ایک کرکے سب نے تھرڈ آپشن پر صاف صاف یا چوری چھپے رضامندی ظاہر کر دی ہے۔ اور ہم خواہ زبان سے کچھ کہیں مگر عملاً منتظر ہیں کہ امریکہ اور مغربی ممالک کا کوئی بھی تصفیہ کرادیں۔ اور بھارت کو این پی ٹی پر دستخط کے لئے رضامند کردیں تو ہم بھی ایٹمی مسئلہ سے اپنی جان چھڑالیں۔ دیکھنا یہ ہے کہ ان سب توقعات کا کیا بنتا ہے۔ امریکہ واقعی اپنے قول و قرار میں سنجیدہ ہے یا اس نے محض ایک نیا دام فریب کھایا ہے۔ تاکہ ہمیں شکار کرے اور مسئلہ یہ بھی ہے کہ امریکہ جو کچھ چاہتا ہے وہ ہم تو ماننے کے لئے تیار بیٹھے ہیں۔ مگر کیا وہ بھارت سے بھی کچھ منوا سکے گا۔

نبی اکرم کی اصل جلالت قدر اور عظمت شان کو
کوئی نہیں جان سکتا، مختصراً یہی کہا جاسکتا ہے کہ
"بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر"
جانئے یہ اصل قابل غور مسئلہ یہ ہے کہ:
کیا ہم آپ کے دامن سے صحیح طور پر وابستہ ہیں؟
اس لئے کہ اسی پر ہماری نجات کا دارو مدار ہے
اس اہم موضوع پر
ڈاکٹر اسرار احمد کی مختصر لیکن نہایت مؤثر تالیف
نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے
ہمارے تعلق کی بنیادیں
کا خود بھی مطالعہ کیجئے اور اسکو پھیلاکر تعاون علی البر کی سعادت حاصل کیجئے
مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

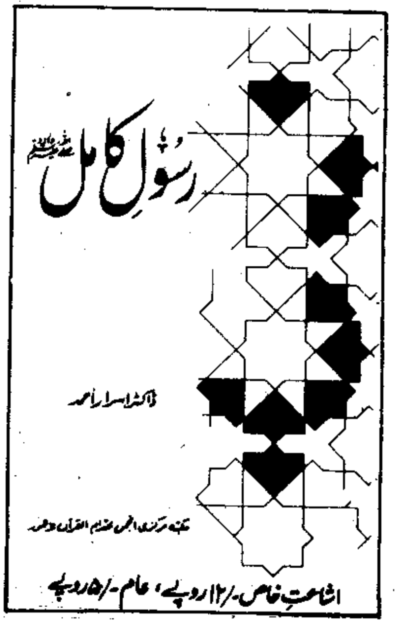

خواتین کے اصل مسائل کو سمجھنے کی ضرورت ہے

مردوں سے زیادہ عورت نے خود اپنے اوپر ظلم کیا ہے

تہذیب مغرب عورتوں کے حقوق کی قاتل ہے

محمد سمیع

الیکشن ۹۳ء کے سلسلے میں رائے عامہ ہموار کرنے کے لئے پی ٹی وی نے سیاسی جماعتوں کے قائدین کو ایک اچھا موقع فراہم کیا تھا کہ وہ لوگوں کے سامنے اپنی جماعت کے منشور کو واضح کر سکیں۔ اس سلسلے میں صحافیوں نے بھی اپنا کردار احسن طریقے سے ادا کیا اور انہوں نے ان قائدین کے سامنے ایسے سوالات رکھے جس سے لوگوں کے ذہن صاف ہوئے۔ ان میں ایک مسئلہ خواتین کو درپیش مسائل کا بھی تھا۔ اس سلسلے میں بھی مختلف سوالات کئے گئے۔ سوالات کی نوعیت اور سیاسی جماعتوں کے قائدین کے ان پر ردعمل پر تو ہم بعد میں گفتگو کریں گے اس سے قبل ہمیں یہ دیکھنا پڑے گا کہ خواتین کو ہمارے ملک میں کس نوعیت کے مسائل کا سامنا ہے۔

تمدن کے ارتقاء نے لوگوں کو مادہ پرستی کی دوڑ میں مبتلا کیا تو مرد نے جو خاندان کی کفالت کا ذمہ دار ہے، محسوس کیا کہ ضروریات زندگی کے روز افزوں اضافے کے چیلنج سے عہدہ برآ ہونا اکیلے اس کے بس کی بات نہیں۔ معیار زندگی میں اضافہ ممکن نہیں جب تک معاشی میدان میں عورتوں کو شانہ بشانہ کام کرنے کا موقع فراہم نہ کیا جائے۔ لہٰذا عورت نے اللہ تعالیٰ کے اس حکم کے علی الرغم گھر سے باہر قدم نکالا کہ خواتین نہایت وقار کے ساتھ اپنے گھروں میں جمی رہیں۔ اس سے قبل بھی عورتیں ناگزیر صورتحال میں گھر سے باہر قدم نکالتی تھیں لیکن ایسا نہیں چونکہ انتہائی مجبوری کے عالم میں اور وہ بھی کبھی کبھی ہی کرنا پڑتا تھا لہٰذا شرع کی اس پابندی کے ساتھ نکلتی تھیں کہ ان کا پورا جسم چہرے سمیت ڈھکا ہوتا تھا۔ مجھے آج بھی یاد ہے کہ قیام پاکستان کے بعد جب شرفاء کی خواتین کا باہر نکلنا ہوتا تھا تو جس بگھی گاڑی یا سائیکل رکشاء میں انہیں سفر کرنا ہوتا تھا پہلے اس کے چاروں طرف چادریں لپیٹی جاتی تھیں اور خواتین مکمل پردے میں مکان سے باہر قدم نکالتی تھیں۔ اس طرح نامحرموں کی نظروں سے محفوظ رہتی تھیں۔ لیکن آج خواتین کا گھر سے باہر نکلنا اپنی رضامندی کے ساتھ اور روزانہ ہوتا ہے۔ خصوصاً دفتروں میں کام کرنے والی خواتین کا معاملہ تو یہی ہے لہٰذا اسے اس کی قیمت بھی ادا کرنی پڑتی ہے جو بے پردگی سے شروع ہو کر مخلوط معاشرت اور نتیجتاً جنسی ہیجان تک پہنچتی ہے۔ گھر سے باہر نکلتی ہے تو اسے ٹرانسپورٹ کے مسئلہ کا سامنا ہے، بس یا ویگن میں مخصوص سیٹوں پر رش کے دوران مردوں کا قبضہ ہوتا ہے۔ اگر عورت میں شرافت کا تناسب بیباکی اور بے حیائی سے زیادہ ہے تو وہ بیچاری گھنٹوں بس اسٹاپ پر کھڑی رہنے پر مجبور ہے ورنہ کسی نہ کسی طرح گاڑی میں داخل ہو کر مردوں کے درمیان سمٹی سمٹائی کھڑی یا بیٹھی دکھائی دیتی ہے۔ ڈرائیور صاحبان کا حال یہ ہے کہ خاتون کو دیکھ کر انہیں موسیقی سے لطف اندوز ہونے کا شوق اس درجہ مجبور کرتا ہے کہ نہ صرف فحش گانوں بلکہ آج کل تو عشقیہ مکالموں والی ریکارڈنگ سے اس خاتون کا استقبال کرتے ہیں۔ عورت بیچاری کیا اس کے خلاف آواز بلند کر سکتی ہے جبکہ بسوں میں سفر کرنے والے مرد حضرات جن میں "صوفی وملا" قسم کے لوگ بھی شامل ہوتے ہیں وہ بھی ڈرائیور کو ٹوکنے کی زحمت گوارا نہیں کرتے بلکہ اگر کبھی کسی مرد کی غیرت جوش میں آتی ہے اور وہ ریکارڈنگ بند کرنے کو کہتا ہے تو بیک وقت کئی افراد ڈرائیور کو ریکارڈنگ جاری رکھنے کی فرمائش کرنے لگتے ہیں۔

ہمارے دفتروں کا ماحول بھی خواتین کے لئے کچھ مختلف نہیں۔ کیا ہوا وہاں ریکارڈنگ نہیں ہوتی لیکن عورتوں کو متوجہ کرنے کے اور بھی بے شمار طریقے ہیں جو استعمال کئے جاتے ہیں۔ حکیم و علیم ہستی جس نے عورتوں کی عصمت و عفت کے تحفظ کے لئے قوانین وضع کئے ہیں لیکن ہم اپنے آپ کو نعوذ باللہ اس سے زیادہ حکیم و علیم سمجھتے ہیں جبھی تو خواتین کو گھر سے باہر محض دنیا کی متاع قلیل کے لئے نکلنے پر مجبور کرتے ہیں۔ اس کے نتیجے میں بے شمار مسائل جنم لیتے ہیں۔ سب سے پہلے تو اس خاتون پر نفسیاتی دباؤ ہوتا ہے۔ احکام خداوندی پر عمل کرنے میں عورت مرد سے زیادہ حساس ہے۔ اسے ہر دم یہ احساس پریشان کئے رہتا ہے کہ اس سے اللہ تعالیٰ کی حکم عدولی ہو رہی ہے جسے شاید وہ یہ سوچ کر دور کرتی ہے کہ دنیا کی بیشتر آبادی اللہ تعالیٰ کی حکم عدولی کر رہی ہے اگر اس جیسی کمزور مخلوق سے یہ جرم سرزد ہوا تو کیا ہوا، کم از کم دنیا کی زندگی تو سنور رہی ہے۔ اور اگر خدانخواستہ کسی خاتون سے لغزش سرزد ہو جاتی ہے جس کا ہر دم احتمال رہتا ہے تو جنسی جرائم کی وہ ہولناک خبریں اخباروں کی زینت بنتی ہیں کہ جن کو پڑھ کر انسان کانپ اٹھتا ہے۔ اور فی زمانہ ایسی خبریں تو روزانہ کا معمول بنتی جارہی ہیں۔ عورت بے چاری بھی کیا کرے۔ اس کی دینی تعلیم کا اس ترقی یافتہ مہذب دنیا میں کس کو فکر ہے۔ لوگوں کی عظیم اکثریت خود دین کے علم سے بے بہرہ ہے تو وہ اپنی خواتین کے لئے اس بارے میں کیسے فکر کر سکتے ہیں۔ تعلیم گاہوں میں حال یہ ہے کہ علیحدہ کالج اور یونیورسٹی کا اس کے لئے کوئی انتظام نہیں ہے۔ اسے مردوں کے درمیان ہی رہ کر تعلیم حاصل کرنا ہے۔ جب ضیاء الحق مرحوم جیسا تہجد گزار حکمران اپنے گیارہ سالہ دور اقتدار میں، وہ بھی بحیثیت چیف مارشل لاء ایڈ منسٹریٹر خواتین کے لئے علیحدہ یونیورسٹیاں قائم نہ کر دا سکا تو لوگ قاضی حسین احمد کی بات کا یقین کیسے کر سکتے ہیں۔ ان کی بات بھی اس غیر سنجیدہ انداز میں کہ گورنر ہاؤسوں کو خواتین یونیورسٹیوں میں تبدیل کر دیا جائیگا۔

خواتین کی صحت کا مسئلہ مردوں سے زیادہ تشویشناک ہے کہ بچوں کی پیدائش وہ بھی آج کے سائنسی دور میں آپریشنوں کے ذریعے۔ آج کے ہسپتالوں میں زچگی کا یہی ذریعہ سب سے آسان اور

نفع بخش تصور کیا جاتا ہے۔ اس کے نتیجے میں عورتوں کو اتنے عوارض لاحق ہو جاتے ہیں کہ ان کی زندگی ایک مسلسل عذاب بن جاتی ہے۔ وہ عورتیں خوش قسمت تھیں جو سرجری کے وجود میں آنے سے پہلے زچگی کے دوران مرجاتی تھیں کہ انہیں زندہ رہ کر عذاب نہ برداشت کرنا پڑتا تھا اور نہ یہ شرح اموات اتنی زیادہ تھی یا آج کی یہ عورتیں بدقسمت ہیں جنہیں بچوں کے حصول کے لئے آپریشن در آپریشن کے عذاب سے گزرنا پڑتا ہے۔ میٹرنٹی ہومز کی تعداد میں روز افزوں اضافہ ہے لیکن ساتھ ہی ساتھ ناتجربہ کار اسٹاف کی تعداد بھی بڑھتی جارہی ہے۔ لیکن اس پر مستزاد ادویہ کی قلت اور ان کی آسمان پر پہنچی ہوئی قیمتیں' مہنگائی کے مسئلہ نے نہ صرف مردوں کو پریشان کر رکھا ہے بلکہ یہ تو خاتون خانہ کے لئے بھی زیادہ اہم مسئلہ ہے۔ چونکہ گھر گرہستی کا انتظام تو بیشتر اسے ہی کرنا پڑتا ہے۔

مخلوط معاشرے کی جھلک صرف دفاتر ہی میں نظر نہیں آتی بلکہ ہسپتالوں میں بھی مریضوں کی تیمارداری نرسوں کو کرنی پڑتی ہے۔ لیڈی ڈاکٹرز' ڈاکٹر صاحبان کے ساتھ کام کرنے پر مجبور ہیں۔ پی آئی اے کی ایئر ہوسٹس کو مہینوں گھر سے باہر بغیر محرم کے ڈیوٹی پر رہنا پڑتا ہے جبکہ اللہ تعالیٰ نے عورتوں کے لئے سفرحج کے دوران بھی محرم رشتہ دار کو ساتھ رکھنے کا حکم دیا ہے۔ میرے لئے ممکن نہیں کہ میں اس ظلم کی تفصیل بیان کر سکوں جو آج کے دور میں خواتین کے ساتھ روا رکھا جارہا ہے یا خواتین نے خود اپنے اوپر روا رکھا ہوا ہے۔ جس کے نتیجے میں خاندان کا ادارہ تباہ ہو رہا ہے۔ اولاد کی تربیت صحیح خطوط پر نہیں ہو پا رہی ہے کہ عورت یا تو ملازمت کرلے یا بچوں کی پرورش کرلے۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ نے اس کی جسمانی ساخت اور نفسیاتی کیفیات کی بناء پر اس کا دائرہ کار مردوں سے مختلف رکھا تھا۔ خواتین کا دائرہ عمل گھر کے اندر خانہ داری اور بچوں کی پرورش اور ان کی مناسب تربیت ہے اور مرد کو اس کے نان نفقہ کا ذمہ دار بنایا ہے۔ لہٰذا اسے عورتوں پر فضیلت دی ہے۔ اب آج کی عورت خود پیسے کما رہی ہے تو وہ مرد کی حاکمیت کو کس طرح تسلیم کر سکتی ہے۔ نتیجتاً طلاق کی شرح میں بھی اضافہ ہو رہا ہے' خاندان میں بدمزگیاں بھی جنم لے رہی ہیں اور نفسیاتی امراض میں بھی اضافہ ہو رہا ہے۔

اب آئیے ان سوالات کی طرف جو صحافی حضرات نے خواتین کے بارے میں سیاسی قائدین سے کئے۔ سوالات بیشتر تو عام نوعیت کے (اجمالی نہ کہ تفصیلی) تھے یا پھر حدود آرڈیننس اور قانون شہادت کے حوالے سے گویا کہ عورتوں کے سارے مسائل کی جڑ بنیاد مذکورہ قوانین بلکہ اگر سیدھے الفاظ میں کہا جائے تو خود مذہب قرار پاتا ہے۔ بڑی حیران کن بات ہے کہ مساوات مرد و زن کی علمبردار بائیں بازو کی جماعتوں کو اگر فکر تھی تو صرف خواتین کی اسمبلی میں مخصوص نشستوں کی۔ تعلیم' صحت' روزگار اور اس قسم کے دوسرے مسائل جن کا خواتین کو سامنا ہے اس کے بارے میں ان کے منشور میں کوئی تفصیلی پروگرام نہیں۔ البتہ انہیں اس ظلم و زیادتی کی بڑی فکر ہے جو خواتین پر حدود آرڈیننس نے روا رکھا ہوا ہے۔

جہاں تک مذہبی جماعتوں کا تعلق ہے تو اگر ان کے پاس خواتین کے مسائل کے بارے میں پروگرام نہیں تو کم از کم ان میں اتنی جراءت بھی نہیں کہ اس حق بات کا دو ٹوک انداز میں اعلان کر سکیں کہ شریعت نے خواتین کو جو حقوق دیئے ہیں وہ اگر انہیں دلوانے کے لئے پورا زور لگائیں گے تو خواتین پر جو پابندیاں شریعت نے لگائی ہیں وہ انہیں ان کا پابند بھی کریں گے۔ پردے کے معاملے میں اگر مدافعت سے کام لیا گیا اور اس طرح کتمان حق کا ارتکاب کیا گیا تو عورت کی سربراہی کی نفی بھی بڑے معذرت خواہانہ انداز میں کی گئی۔

ایسے میں ان دو قائدین کا رویہ واقعی قابل داد ہے جس کا تذکرہ نہ کرنا ظلم ہوگا۔ حدود آرڈیننس کے بارے میں یہ بات بجا طور پر کہی گئی کہ اس کی بنیاد قرآن و سنت پر ہے جس سے کسی کو اختلاف نہیں۔ اگر اس قانون کے غلط استعمال سے خواتین کے ساتھ زیادتی ہوئی ہے تو اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ اس پر خط تنسیخ پھیر دی جائے بلکہ درست قدم یہ ہوگا کہ اس کے غلط استعمال کو روکا جائے اور اس کے لئے قانون سازی کی جائے۔ قانون شہادت کے بارے میں بھی بڑی عمدہ بات کہی گئی کہ اس قانون سے خواتین کی زندگی پر اتنا اثر نہیں ہے جتنا کہ خواتین کو درپیش دیگر مسائل کا ہے۔۔

نکل جاتی ہو جس کے منہ سے سچی بات مستی میں
فقیہ مصلحت بیں سے وہ رند بادہ خوار اچھا

خواتین کے مسائل کو اس کے صحیح تناظر میں دیکھنا اور ان کا حل دینی نقطۂ نگاہ سے پیش کرنا ضروری ہے۔ یہی ان کے مسائل کے حل کا صحیح راستہ ہے۔ آیئے اب ہم اس پر غور کرتے ہیں۔

اسلام کے ظہور سے قبل عورت یا تو عرب کے معاشرے میں ذلت کا نشان سمجھی جاتی تھی جسے پیدا ہوتے ہی زندہ دفن کر دیا جاتا تھا یا اس وقت کی متمدن قوموں میں اس کی حیثیت مردوں کی کنیز تھی کہ وہ اسے جس طرح چاہے استعمال کریں۔ اسلام نے عورت کا وقار اس طرح بحال کیا کہ ماں کے قدموں تلے جنت قرار دیا' بیٹی کی پرورش کو جنت کے حصول کا ذریعہ بنایا اور بیوی کو آنکھوں کی ٹھنڈک قرار دیا۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ عورت کے وقار کو قائم رکھنے کے لئے اس پر چند پابندیاں بھی عائد رکھیں۔ اس کا دائرہ کار مردوں کے دائرہ کار سے قطعی مختلف رکھا اور اس کی ذمہ داری مرد کی عزت اور اس کے مال کی حفاظت اور اس سے بڑھ کر بچوں کی تعلیم و تربیت کو قرار دیا۔ خاندان کا ادارہ جو کسی معاشرے کی بنیادی اکائی کی حیثیت رکھتا ہے اس کے اس استحکام کے لئے ستر و حجاب کے احکام نازل ہوئے۔ زنا کو سنگین ترین جرم قرار دیا گیا اور اس کے لئے سخت ترین سزائیں مقرر کی گئیں۔ گھر کے اندر محرموں کو بھی پابند کیا گیا کہ وہ اپنی نظریں نیچی رکھیں اور ناگزیر حالات میں عورت کے باہر نکلنے کی صورت میں اس پر پابندی عائد کی کہ وہ ایک بڑی چادر سے اپنے آپ کو لپیٹ لے اور اس کا ایک سرا اپنے چہرے پر لٹکا لے۔ عورت کو پابند کیا گیا کہ وہ نامحرم سے ناگزیر حالات میں گفتگو کی صورت میں اپنی آواز میں لوچ پیدا نہ کرے اور اگر کوئی زیور پاؤں میں ہو تو پاؤں زمین پر مار کر نہ چلے کہ زیور کی جھنکار کسی نامحرم کے کانوں میں پڑے۔

آج کے معاشرے میں عورت ملازمت کے لئے گھر سے باہر نکلتی ہے تو اس کے لئے ان قوانین پر پابندی تقریباً ناممکن ہے۔ لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ عورت اگر ضروری محسوس کرے اور ملازمت اختیار کرنا چاہے تو اس پر ملازمت کو مطلقاً حرام قرار دیا جائے۔ ایسی ملازمتوں کا بندوبست ہو سکتا ہے کہ جن میں عورت شریعت کی پابندی کر سکتی ہے۔ پرائمری سطح تک تعلیم کو عورتوں کے حوالے کیا جا سکتا ہے اور اس سے بہتر نتائج حاصل کئے جا سکتے ہیں کہ عورت بچوں کی نفسیات سے مرد سے زیادہ واقف ہوتی ہے۔ پھر اس میں ماتا کا جذبہ ہوتا ہے عورتوں کے لئے کاٹیج انڈسٹریز قائم کی جا سکتی ہیں جنہیں خود عورتیں ہی چلائیں۔ آج بھی قوم کی لاکھوں عورتیں

(باقی صفحہ ۱۸ پر)

پاکستان میں آئندہ صف بندی نئی بنیادوں پر ہوگی

مسلم لیگ کسی دور میں بھی داخلی انتشار سے محفوظ نہیں رہی

جماعت اسلامی قیادت کا خلا پر کر سکتی ہے---- لیکن کیسے؟

کلیم اللہ

حالیہ انتخابات کے بعد جو صورت حال سامنے آئی ہے اس کے نتیجے میں ہمارا ملک واضح طور پر دو جماعتی نظام کی شاہراہ پر گامزن ہو گیا ہے جو کہ موجودہ جمہوری نظام کے حوالے سے یقیناً ایک خوش آئند بات ہے۔

ان انتخابات کے نتیجے میں ایک پارٹی جو سامنے آئی ہے وہ پیپلزپارٹی ہے۔ لیکن دوسری پارٹی کے طور پر فی الحال کوئی جماعت حقیقی طور پر سامنے نہیں آئی۔ شائد اکثر احباب یہ بات پڑھ کر چونک جائیں۔ کیونکہ بظاہر جو دوسری پارٹی ابھر کر سامنے آئی ہے وہ مسلم لیگ (نواز گروپ) ہے۔ یہ بات اپنی جگہ درست ہے کہ مسلم لیگ (نواز گروپ) نے اس خلاء کو عارضی طور پر پر کیا ہے۔ لیکن یہ تلخ حقیقت اپنی جگہ موجود ہے کہ مسلم لیگ جو آج نجانے کتنے گروپوں میں بٹی ہوئی ہے' حقیقتاً کبھی بھی ایک پارٹی نہیں رہی۔ حقیقی پارٹیاں تو اپنا وجود اور شناخت کبھی بھی نہیں کھوتیں۔ اس استدلال کو مزید واضح کرنے کے لئے ہمیں تاریخ پاکستان کی ورق گردانی کرنا پڑے گی۔

سب سے پہلے تو ہمیں بانی پاکستان قائداعظمؒ کا وہ قول ذہن میں تازہ کرنا ہوگا۔ انہوں نے فرمایا تھا "میری جیب میں سب سکے کھوٹے ہیں"۔ تاریخ کے اوراق کو پلٹیے اور قیام پاکستان کے بعد مسلم لیگ کی تاریخ کا جائزہ لیجئے۔ کیا بانی پاکستان کا یہ قول حرف بحرف درست ثابت نہیں ہوا؟ کس طرح اقتدار کی خاطر جوتیوں میں دال بٹتی رہی۔ کیا یہ حقیقت سامنے نہیں آئی کہ جس طرح مچھلی پانی کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی اسی طرح مسلم لیگ جب بھی اقتدار کے ایوانوں سے باہر ہوئی ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو گئی۔ یہ ہماری تاریخ کے ایسے تلخ حقائق ہیں جن سے آنکھ چرانا احمقوں کی جنت میں بسنے کے مترادف ہے۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ایسا کیوں ہوا؟ جواب اس کا ہمارے نزدیک بالکل سیدھا سا ہے۔ جماعتیں تحریکوں سے بنتی ہیں۔ کوئی تحریک ہی کسی جماعت کے کارکنوں کی ٹریننگ کا موجب بنتی ہے۔ لیکن جب منزل معین نہ ہو اور ہدف صرف اور صرف کرسی اقتدار پر براجمان ہونا ہی ٹھہرے تو اس طرح کے المیے کا وقوع پذیر ہونا ناگزیر ہے جو مسلم لیگ کے ساتھ بھی ہوا۔ کیا یہ حقیقت نہیں کہ جب پاکستان کا قیام صاف دیوار پر لکھا نظر آنے لگا تو وہ ابن الوقت لوگ جو کانگرس اور حکومت برطانیہ کا دم بھرتے تھے جوق در جوق مسلم لیگ میں شامل ہونا شروع ہو گئے اور سارے کا سارا اختیار انہیں کے ہاتھوں میں مرکوز ہو گیا۔ اقتدار کی اسی بندر بانٹ کا نتیجہ ہمارے سامنے ہے۔

پاکستان کی تاریخ ان المیوں سے بھری پڑی ہے۔ زیادہ دور جانے کی ضرورت نہیں اس کا حالیہ مظاہرہ صدارتی انتخابات کے موقع پر دیکھنے میں آیا۔ 38 ارکان اسمبلی جن کا تعلق مسلم لیگ (نواز گروپ) سے تھا' نے فاروق لغاری صاحب کو ووٹ دیے۔ ہمارا گمان غالب ہے کہ بس تھوڑا اور انتظار کیجئے کہ مزید کتنے ارکان اسی اقتدار کی خاطر حکومت کے دروازوں کو کھٹکھٹائیں گے۔ اور کتنے باقی مسلم لیگ یعنی اپوزیشن میں رہ جائیں گے۔ پھر ہی بات پوری طرح واضح ہوگی کہ اس دو جماعتی نظام میں پیپلزپارٹی کے مقابلے میں دوسری پارٹی کون سی ہے۔

جہاں تک پیپلزپارٹی کا تعلق ہے تو اس کا بڑے سے بڑا نقاد بھی اب یہ بات تسلیم کرنے پر مجبور ہے کہ وہ ایک حقیقی جماعت ہے' جس کو طویل مارشل لاء کی سختیاں اور انتہائی ناموافق حالات بھی ختم کرنے سے قاصر رہے۔ اگرچہ بعض لوگ پی پی کو بھی چھوڑ گئے لیکن بحیثیت جماعت وہ آج بھی قائم ہے۔

اب ہم اپنے اصل موضوع کی طرف آتے ہیں اور وہ ہے "حالیہ انتخابات میں مذہبی سیاسی جماعتوں کا کردار"۔ اس سلسلے میں پہلی بات تو یہ ہے کہ ان انتخابات میں انقلابی نظریات کی حامل دینی سیاسی جماعت تو صرف ایک ہی تھی' جس نے اسلامک فرنٹ کے نام سے انتخابات میں حصہ لیا۔ باقی تمام جماعتیں تو محض مذہبی جماعتیں تھیں جن کی بنیاد کسی نہ کسی مسلک سے تھی۔ انقلابی کام تو کبھی ان جماعتوں کے پیش نظر رہا ہی نہیں۔ یہ لکھتے ہوئے افسوس ہوتا ہے کہ ان جماعتوں کی سوچ اس قدر جامد ہے کہ قوم تقسیم در تقسیم ہوتی چلی گئی۔

آج ہمیں مولانا ابو الکلام آزادؒ کا وہ مقولہ یاد آرہا ہے جو انہوں نے قرآن کی دعوت کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ "نزول قرآن کے وقت دنیا کا مذہبی تخیل اس سے زیادہ وسعت نہی رکھتا تھا کہ نسلوں' خاندانوں اور قبیلوں کی معاشرتی حد بندیوں کی طرح مذہب کی بھی ایک خاص گروہ بندی کرلی گئی تھی۔ ہر گروہ بندی کا آدمی سمجھتا تھا کہ دین کی سچائی صرف اسی کے حصے میں آئی ہے۔ جو انسان اس کی مذہبی حد بندی میں داخل ہے وہ نجات یافتہ ہے۔ جو داخل نہیں' نجات سے محروم ہے"۔ مزید فرماتے ہیں "اس نے بتایا کہ خدا کا دین اس لئے تھا کہ نوع انسانی کا تفرقہ اور اختلاف دور ہو۔ اس لئے نہ تھا کہ تفرقہ اور نزاع کی علت بن جائے۔ پس اس سے بڑھ کر گمراہی اور کیا ہو سکتی ہے کہ جو چیز تفرقہ دور کرنے آئی تھی اسی کو تفرقہ

(باقی صفحہ ۱۸ پر)

دستور اسلامی کا مطالبہ صحیح تھا' انتخابی سیاست میں کودنے کا فیصلہ درست نہ تھا!

یہ راستہ 'منزل کی طرف جانے والا نہیں!

قاضی صاحب نے ایک ہی جھٹکے میں جماعت کو اس کے منطقی انجام تک پہنچا دیا

نثار احمد ملک

۱۵ نومبر کے روزنامہ نوائے وقت لاہور میں سابق امیر جماعت اسلامی محترم میاں طفیل محمد صاحب کا ایک مضمون شائع ہوا۔ جس کا عنوان ہے "ڈاکٹر اسرار احمد کے جواب میں۔" محترم میاں طفیل محمد جماعت اسلامی کے بزرگ ترین رہنما ہیں۔ ہمارے لئے بھی وہ بہت ہی محترم ہیں۔ میاں طفیل محمد جماعت اسلامی یا اس کے دوسرے نام اسلامک فرنٹ کے حالیہ انتخابات میں کارناموں سے بہت نالاں ہیں۔ لہٰذا اس کی گرفت انہوں نے کھل کر کی ہے۔ لیکن وہ اس اصل مرض کے علاج کی فکر نہیں کرتے جس کے یہ سب برگ و بار ہیں۔ لہٰذا ہمارے نزدیک اصل مرض انتخابی سیاست میں شمولیت ہے۔ جبکہ میاں صاحب انتخابی سیاست سے دستبردار ہونے کو تیار نہیں ہیں اور جماعت کو پاک صاف بھی دیکھنا چاہتے ہیں۔

چنانچہ انہوں نے اپنے متذکرہ بالا مضمون میں بھی اسی بات پر زور دیا ہے۔ اس مضمون کا پہلا نکتہ یہ ہے کہ ڈاکٹر اسرار احمد کا موقف یہ ہے کہ مولانا مودودی مرحوم ۱۹۳۷ء سے ۱۹۴۷ء تک تو اسلامی تحریک کو بالکل صحیح نہج پر چلا رہے تھے لیکن پاکستان میں آکر ایک دوسری راہ نکل گئے۔ محترم میاں صاحب نے ڈاکٹر صاحب کا موقف بالکل صحیح نقل کیا ہے۔ جبکہ خود میاں صاحب کا کہنا ہے ۱۹۴۷ء سے قبل مولانا مودودی اور ان کی قوم ایک کافرانہ حکومت اور نظام کے تحت تھے۔ اس لئے وہ اس وقت دعوت اسلامی کا کام اسی نہج پر کر رہے تھے۔ اس کو انہوں نے نبی اکرم ﷺ کی مکی زندگی سے تشبیہ دی ہے۔ پاکستان بننے کے بعد حالات یکسر تبدیل ہو گئے۔ مسلمانوں نے پاکستان کی شکل میں جو ملک حاصل کیا انہوں نے یہ اسلامی ریاست کے قیام ہی کے لئے حاصل کیا تھا۔

اس موقع پر اس وضاحت سے قبل کہ قیام پاکستان کے نتیجے میں جو نئے حالات پیدا ہوئے ان کے حوالے سے جماعت کو اپنی پالیسی میں کیا تبدیلی کرنا چاہئے تھی' انتخابی سیاست کا راستہ اختیار کرنا چاہئے تھا یا احتجاجی سیاست کا' مناسب ہو گا کہ میاں صاحب کے موجودہ موقف اور جماعت کے سابقہ موقف میں موجود تضاد کو سمجھ لیا جائے۔

میاں صاحب کی اس بات کو اگر درست مان لیا جائے تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر پاکستان کا حصول ایک اسلامی ریاست کے قیام کے لئے تھا تو مولانا مودودی اور جماعت اسلامی نے اس تحریک میں شمولیت کیوں اختیار نہ کی۔ اور نہ صرف یہ کہ اس جدوجہد میں وہ اور ان کی جماعت شریک نہیں ہوئے بلکہ مسلم لیگ پر اپنے تیز و تند اور زور دار قلم کے نشتر چلاتے رہے۔ چنانچہ ان کا مسلم لیگ اور اس کی جدوجہد کے بارے میں موقف تھا کہ یہ ایک قومی تحریک ہے اور اس سے محض ایک قومی ریاست وجود میں آئے گی' اسلامی ریاست نہیں۔ چنانچہ وہ "سیاسی کشمکش حصہ سوم" میں لکھتے ہیں۔

"اگرچہ ہندوستان کے مسلمانوں میں اسلام اور مسلم قوم پرستی ایک مدت سے خلط ملط ہیں' لیکن قریبی دور میں اس معجون کا اسلامی جزو اتنا کم اور قوم پرستانہ جزو اتنا زیادہ بڑھ گیا ہے کہ مجھے اندیشہ ہے کہ کہیں اس میں نری قوم پرستی ہی قوم پرستی نہ رہ جائے"۔ ایک دوسرے مضمون میں لکھتے ہیں " ان کے لئے یہ کافی ہے کہ ان کی ایک لیگ ہو' جس میں وہ سب لوگ ایک پلیٹ فارم پر جمع ہو جائیں جو مسلمان کہلاتے ہیں اور مسلمانوں کے نظام معاشرت سے وابستہ ہیں۔ انہی کے گروہ کے کچھ لوگ ان کے قائد ہوں جن کے اشاروں پر حرکت کریں۔ اور ان کی تمام جدوجہد کا مقصود یہ ہو کہ جو کچھ ان کے ہاتھ میں ہے وہ جانے نہ پائے اور جو کچھ مزید ہاتھ آسکتا ہو وہ آجائے۔ قطع نظر اس سے کہ اسلام جس کے نام سے یہ اپنی قوم کو مسلمان کہتے ہیں اس کو جائز سمجھتا ہو یا نہ سمجھتا ہو---؟ (نسلی مسلمانوں کے لئے دو راہیں)

مولانا مودودی "سیاسی کشمکش حصہ سوم" کے آخر میں رقم طراز ہیں : "جو کچھ عرض کیا جا چکا ہے اس سے تین حقیقتیں پوری طرح واضح ہو جاتی ہیں: ایک یہ کہ اسلام کا مقصد زندگی کے فاسد نظام کو بالکل بنیادی طور پر بدل دینا ہے۔ دوسرے یہ کہ یہ کلی اور اساسی تغیر صرف اس طریق پر ممکن جو انبیاء علیہم السلام نے اختیار کیا تھا۔ تیسرے یہ کہ مسلمانوں میں اب تک جو کچھ ہوتا رہا ہے وہ نہ اس مقصد کے لئے اور نہ اس طریق پر ہے"۔ اس کے بعد مولانا فرماتے ہیں "بعض لوگ یہ خیال ظاہر کرتے ہیں کہ ایک دفعہ غیر اسلامی طرز ہی کا صحیح مسلمانوں کا قومی اسٹیٹ قائم ہو جائے پھر رفتہ رفتہ تعلیم و تربیت اور اخلاقی اصلاح کے ذریعے سے اس کو اسلامی اسٹیٹ میں تبدیل کیا جاسکتا ہے۔ مگر میں نے تاریخ' سیاسیات اور اجتماعیات کا جو تھوڑا بہت مطالعہ کیا ہے اس کی بنا پر اس کو ناممکن سمجھتا ہوں"۔

قارئین کرام یہ تھا مولانا کا تقسیم ہند سے قبل کا موقف جبکہ محترم میاں صاحب آج کہتے ہیں کہ پاکستان کا حصول اسلامی ریاست کے قیام کے لئے تھا! یہاں دوسرا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر پاکستان کا حصول اسلامی ریاست کے قیام کے لئے تھا تو پھر وہ کون لوگ ہیں جو اسے سیکولر بنانے پر تلے ہوئے ہیں؟ یہ ایک حقیقت ہے کہ قیام پاکستان کے بعد جن لوگوں کے کے ہاتھوں میں اس کی زمام کار آئی وہ سب وہی تھے جنہوں نے تحریک پاکستان میں حصہ لیا تھا۔ انہوں نے پاکستان کو اسلامی ریاست میں کیوں نہ

تبدیل کیا۔ اگر وہ یہ کہیں کہ ہم نے پاکستان کو اسلامی ریاست بنادیا ہے یعنی قیام پاکستان سے قبل ہمارے ذہن میں "اسلامی ریاست" کا جو تصور اور خاکہ تھا اس کے مطابق ہم نے اسلامی ریاست قائم کردی ہے تو پھر میاں صاحب اور ان کی جماعت کس لئے کوشش کر رہے ہیں؟

ایک اور اہم بات یہ ہے کہ اگر جماعت اسلامی نے قیام پاکستان کے بعد اپنے موقف اور منہج میں کوئی تبدیلی نہیں کی تھی بلکہ پاکستان کے قیام کے بعد حالات چونکہ تبدیل ہوگئے تھے لہٰذا حکمت عملی یا پالیسی بدلی تھی تو پھر سانحہ ماچھی گوٹھ کیوں پیش آیا؟ اور جماعت اسلامی کی دوسری صف کے تقریباً تمام نمایاں لوگ جماعت اسلامی کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے خیر آباد کہہ گئے۔ ۵۶ء کا سانحہ ماچھی گوٹھ کے موقع پر بعض لوگوں نے تو یہ بھی تجویز دی تھی کہ ہمیں دعوت کے کام پر زیادہ توجہ دینے کے لئے کچھ عرصہ کے لئے انتخابی سیاست کو چھوڑ دینا چاہئے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ جماعت اسلامی کا طریق کار اور موقف قیام پاکستان سے پہلے بالکل ایک اصولی اسلامی انقلابی جماعت کا تھا جبکہ قیام پاکستان کے بعد ایک قومی مذہبی سیاسی جماعت میں تبدیل ہوگیا۔

جہاں تک دستور اسلامی کا مطالبہ کرنے اور اس کے لئے جدوجہد کرنے کا تعلق ہے تو یہ صد فی صد درست ہے۔ اس لئے کہ اس وقت جماعت اسلامی نے یہ کوشش بطور ایک فریق یا سیاسی حریف کے نہیں کی تھی اور جماعت کو اسی لئے ملک گیر تعاون بھی حاصل ہوا تھا۔ اور یہ مطالباتی اور احتجاجی سیاست ہی درحقیقت کرنے کا اصل کام تھا۔ قیام پاکستان کے بعد حالات میں جو تبدیلی آئی اس کے پیش نظر اپنے لائحہ عمل میں کسی قدر تبدیلی یقیناً ضروری تھی اور اس ضمن میں دستور اسلامی کا مطالبہ کرنا اور مہم چلانا یقیناً صحیح سمت میں ایک قدم کا درجہ رکھتا ہے اور اس کی امیر تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد نے ہمیشہ پرزور تائید کی ہے' لیکن براہ راست الیکشن کے میدان میں کود پڑنا اپنے سابقہ موقف سے مکمل انحراف کے مترادف تھا۔ اس لئے کہ یہ ایک طے شدہ بات ہے کہ الیکشن کے نتیجے میں صرف انتظامی ہاتھ بدلتے ہیں' نظام تبدیل نہیں ہوتا۔ جبکہ تقسیم ہند کے نتیجے میں جو ملک مسلمانوں کو حاصل ہوا وہ مولانا مودودی مرحوم کے اپنے الفاظ میں مسلمانوں کی ایک قومی ریاست تو ضرور تھی' "اسلامی ریاست" ہرگز نہیں تھی۔ ہم نے

(باقی صفحہ ۱۸ پر)

'ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کے جواب میں'

میاں طفیل محمد

۵ نومبر ۱۹۹۳ء کے روزنامہ نوائے وقت لاہور میں آپ نے "مولانا حسین احمد مدنی' مولانا ابوالکلام آزاد اور مولانا مودودی" کے عنوان کے تحت اپنے مضمون میں پھر اپنی اسی پرانی بات کو دہرایا ہے کہ مولانا مودودی مرحوم ۱۹۳۹ء سے ۱۹۴۷ء تک تو اسلامی تحریک کو بالکل صحیح نہج پر اور امت پر عائد ہونے والے فریضہ نبوت کی ٹھیک ترجمانی اور ادائیگی کی راہ گامزن رہے لیکن پاکستان میں آکر ایک دوسری راہ پر پڑ گئے۔ جناب من! ۱۹۴۷ء سے پہلے مولانا مودودی اور ان کی قوم ایک کافرانہ حکومت اور نظام کے تحت تھے۔ اس لئے اس وقت وہ دعوت اسلامی کا کام اسی نہج پر کر رہے تھے جیسے نبی کریم ﷺ مکہ میں کفار کے تحت یہ کام کرتے تھے۔ قیام پاکستان کے ساتھ حالات بالکل تبدیل ہوگئے تھے اور سوال یہ سامنے آگیا تھا کہ مسلمانوں نے قیام پاکستان کی صورت میں جو ملک حاصل کیا ہے اور انہوں نے یہ اسلامی ریاست کے قیام کے لئے ہی حاصل کیا تھا' کیا اسے ایک لادین ریاست بن جانے دیا جائے جیسے کہ ۱۱ اگست ۱۹۴۷ء کی مجلس دستور ساز میں گورنر جنرل کی طرف سے کی جانے والی تقریر سے خطرہ بھی سامنے آگیا تھا کہ اب اس نومولود ریاست میں نہ کوئی ہندو ہندو رہے گا نہ مسلمان مسلمان اور نہ عیسائی عیسائی۔ بلکہ سب یکساں پاکستان کے شہری ہوں گے۔ اگرچہ گورنر جنرل نے یہ بات اس وقت پورے ہندو پاکستان میں برپا ہندو مسلم فسادات کے پس منظر میں کہی تھی۔ لیکن اس وقت بھی اور اس کے بعد بھی اب تک قوم کا ایک طبقہ اسے لادین ریاست کے قیام کے معنی میں ہی لیتا ہے۔ اس لئے اگر اس وقت فوراً اسلامی نظام کے قیام کا مطالبہ نہ داغ دیا جاتا جس کی سمجھ اور توفیق بھی مولانا مودودی مرحوم کے سوا کسی دوسرے کو حاصل نہ ہوئی اور وہ پے درپے قربانیاں دے کر اور مصائب بھگت کر جو مولانا مرحوم اور ان کی جماعت نے دیں اور اٹھائیں' قرارداد مقاصد پاس کرا کے پاکستان کا رخ اسلامی ریاست کے قیام کی طرف نہ موڑ دیتے تو ڈاکٹر اسرار احمد آج یہ اسلامی تنظیم اور قرآن کالج اور سلسلہ دروس قرآن کے امیر تنظیم ہونے کے بجائے پھانسی پر لٹک چکے ہوتے اور سب لوگ بھی جو چہروں پر دھڑلے سے ریش ہائے مبارک سجائے ملک کے طول و عرض میں دندناتے پھرتے ہیں۔ یہ مولانا مودودی مرحوم کے اسی فہم و فراست کا ثمرہ ہے کہ آج پاکستان میں قانونی اور دستوری لحاظ سے اسلامی نظام کے علمبردار غداران ملک و ملت نہیں ہیں بلکہ اسلام کے خلاف آواز اٹھانے والے غداران ملک و ملت ہیں۔

مولانا مودودی صاحب کی اس فہم و فراست کا حاصل اور اس کی برکت ہے کہ آپ قیام خلافت' اسلامی انقلاب اور اسلامی جہاد تک کی باتیں ہی نہیں اس مقصد کے لئے کھلے عام تحریکیں چلا رہے ہیں۔

اگر میری ان باتوں کے بارے میں کوئی شک ہے تو مسلمانوں کی قومی سیکولر ریاستوں میں جاکر وہاں یہ کام کرکے تجربہ کرلیجئے۔ ترکی' عراق' شام' مصر' الجزائر اور تیونس وغیرہ کسی ملک میں جہاں مسلمانوں کی سیکولر ریاست ہے وہاں اپنے ان عزائم کا اظہار کریں اور پھر دیکھیں کہ کیا ہوتا ہے۔ مولانا مودودی نے ۱۹۴۷ء میں حالات کے تغیر کے ساتھ ہی طریق کار بدل کر وہ کام کیا جو نئے موجود الوقت حالات میں ایک نظر امام برحق کو کرنا چاہئے تھا۔

اب مولانا مودودی مرحوم کی جماعت اسلامی کی مسلسل قربانیوں اور محنت سے ملک میں ایک دستور بن چکا ہے' اب ضرورت اس امر کی ہے کہ پھر تطہیر افکار اور تعمیر سیرت و کردار اور تربیت و اصلاح یافتہ افراد کی تنظیم کے ذریعہ سے اصلاح معاشرہ پر پوری توجہ صرف کی جائے اور جیسے جیسے یہ اصلاح آگے بڑھتی جائے حکومت کی مشینری کو بھی آئینی اور جمہوری طریقہ سے تبدیل کرنے کی کوشش کی جائے۔ یہاں تک کہ معاشرہ اور حکومت دونوں قرآن و سنت کے رنگ میں رنگ جائیں۔ یہ تھا اور ہے مولانا مودودی کی رہنمائی میں آئینی اور جمہوری طریقہ سے اسلامی انقلاب کا طریقہ۔ کیونکہ اسلامی نظام اور انقلاب زور زبردستی نہیں برضا و رغبت آتا ہے اور آسکتا ہے۔ خوف سے آپ ایک منافق معاشرہ تو وجود میں لاسکتے ہیں۔ حقیقی اسلامی انقلاب تعلیم و تبلیغ اور تبدیلی ذہن و فکر سے ہی آتا ہے۔ جبری اصلاح کا حشر روس' میں آپ کے سامنے ہے اور مارشل لاء کے ذریعے نفاذ اسلام کی کوشش جنرل ضیاالحق شہید نے بھی کی اور پھر وہ یہ کہنے پر مجبور ہوئے کہ اگر میں نے زبردستی کی تو میرے رفقاء اسی شام مجھے آرمی ہاؤس سے اٹھا کر ٹوپی پارک میں پھینک آئیں گے۔

سربراہ مملکت کے عہدے پر بیورو کریٹ قابض رہے!

صدر وزیر اعظم کشمکش نصف صدی کا قصہ ہے

"ضیائی اسلام" نے معروف و منکر کی تقسیم تحفظ اقتدار کے حوالے سے کی ہے

مرزا ایوب بیگ

13 نومبر کو صدارتی انتخاب کے ساتھ انتخابی شیڈول کی تکمیل ہو گئی۔ نومبر88ء سے لے کر نومبر 93ء تک پانچ سال میں انتخابات کی بھرمار سے تنگ آئی ہوئی قوم نے سکھ کا سانس لیا ہے۔ فاروق لغاری کے صدر پاکستان منتخب ہونے کے بعد بازار حصص میں ریکارڈ ساز گرما گرمی اس بات کا ثبوت ہے کہ تاجر اور صنعتکار طبقہ مسلم لیگ کی طرف واضح رجحان رکھنے کے باوجود اصلاً پرسکون حالات' پالیسیوں کے تسلسل اور سیاسی استحکام کا خواہش مند ہے۔ غیر یقینی سیاسی صورت حال ملک کی معیشت' وقار اور اعتماد کے ساتھ وہی سلوک کرتی ہے جو ایک پختہ عمارت کے ساتھ بلڈوزر کرتا ہے۔

حال ہی میں ہونے والی اسحاق نواز کشتی اعلیٰ ترین مناصب رکھنے والے دو افراد کے درمیان پہلی نہیں تھی بلکہ قائد اعظم کے بستر مرگ پر پڑتے ہی اس کشمکش کا آغاز ہو گیا تھا۔ ایک روایت کے مطابق قائد اعظم کے آخری ایام میں جب لیاقت علی خاں زیارت میں ان کی مزاج پرسی کیلئے گئے تو ان کے واپس لوٹنے کے بعد قائد اعظم نے فاطمہ جناح سے کہا "تمہارا کیا خیال ہے یہ میری عیادت کو آیا تھا! نہیں یہ دیکھنے آیا تھا کہ ابھی مرا ہے کہ نہیں"۔ دروغ برگردن راوی۔ یعنی صدر وزیر اعظم کشمکش نصف صدی کا قصہ ہے دو چار دن کی بات نہیں۔ لہٰذا معمولی غور و فکر کرنے والا شخص بھی اس نتیجہ پر پہنچ چکا ہے کہ ہمارے نظام میں کہیں کوئی خرابی ضرور ہے جس سے سیاسی استحکام عنقا ہو چکا ہے۔ پاکستان کی سیاسی تاریخ کا مختصراً لیکن بغور جائزہ لینے ہی سے اس خرابی کی نشاندہی ہو جائے گی۔

فاروق لغاری پاکستان کے گیارہویں سربراہ مملکت ہیں۔ ان سے پہلے 10 سربراہان مملکت میں سے صرف چار سیاسی میدان کے آدمی تھے' جب کہ چھ فوجی یا غیر فوجی بیوروکریٹ تھے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ ان 4 سیاسی شخصیات کا عرصہ اقتدار بمشکل نو سال تھا۔ اور بیوروکریٹوں نے چھتیس سال حکومت کی۔ یعنی سیاسی سربراہان مملکت سے ان کا دور حکومت چار گنا زیادہ تھا۔ جب کہ وزرائے اعظم میں سے صرف چوہدری محمد علی بیوروکریٹ تھے۔

قائداعظم کی وفات کے بعد خواجہ ناظم الدین سربراہ مملکت یعنی گورنر جنرل بنے۔ خواجہ صاحب مسلم لیگ کے رجل رشید تھے۔ لیکن لیاقت علی خان کی شہادت کے بعد خواجہ صاحب نے سربراہ حکومت بننے کو ترجیح دی۔ یہ قدم اس لحاظ سے تو قابل ستائش تھا کہ گو انہوں نے خود کو بے اختیار منصب سے بااختیار منصب پر منتقل کر لیا۔ لیکن گورنر جنرل کی حیثیت سے اپنے آئینی اختیارات سے تجاوز کرنے کی کوشش نہ کی۔ ان کی جگہ گورنر جنرل غلام محمد نے سنبھالی جو پہلا بیوروکریٹ سربراہ مملکت تھا۔ اور جلد ہی اس جنگ کا آغاز ہوا جس کا آخری معرکہ اسحاق نواز شریف کے مابین بڑی بیدردی سے لڑا گیا۔ خواجہ ناظم الدین بیوروکریٹ سربراہ مملکت کے ہاتھوں شہید ہونے والا پہلا سیاستدان تھا۔ مزے کی یا شرم کی بات یہ ہے کہ امریکہ میں پاکستانی سفیر محمد علی بوگرہ کو درآمد کر کے وزیر اعظم مقرر کیا گیا تو وہ پارلیمانی پارٹی جو خواجہ ناظم الدین کو اپنا لیڈر کہتی تھی' اس نے بلاچون وچرا خواجہ صاحب کی برخواستگی اور بوگرہ کی لیڈر شپ کو قبول کر لیا۔ اس فرمانبرداری نے بیوروکریٹ حاکم کی خونخواری میں اضافہ کیا اور گورنر جنرل غلام محمد اپنے ہی مقرر کردہ وزیر اعظم کو مع اسمبلی ہضم کر گیا۔ ان اقدامات سے بیرونی دنیا میں پاکستان کے وقار کو شدید دھچکا لگا۔

بدقسمتی سے سپریم کورٹ نے اپنے فیصلہ کی بنیاد قانون یا حقائق کی بجائے نظریہ ضرورت کو بنایا جس سے عدلیہ کی ساکھ بڑی بری طرح متاثر ہوئی یعنی جمہوریت کے تینوں ستون عدلیہ' انتظامیہ اور مقننہ نے ذاتی اور فوری مفاد کے حصول کیلئے قومی مفاد اور وقار کو روند ڈالا۔ اس طرح خشت اول کی کجی سے ملک آمریت کے اندھے کنویں کی طرف لڑھکنے لگا۔ سکندر مرزا اگلا بیوروکریٹ سربراہ مملکت تھا اس کے دور میں بھی صدر اور وزرائے اعظم کے درمیان بلی چوہے کا کھیل جاری رہا۔ تاآنکہ ملک مکمل طور پر فوجی آمریت کے شکنجے میں کس لیا گیا اور ملک کی جغرافیائی سرحدوں کے محافظ جن کے ذمے جنگلوں' صحراؤں اور میدانوں میں قوم کی حفاظت تھی' ایوان صدر میں براجمان ہو گئے اور اسمبلی کی عمارتوں میں عدالتیں لگنے لگیں اور سکھا شاہی فرامین جاری ہونے لگے۔ ایوبی دور بلاشبہ صنعتی ترقی کا دور تھا لیکن سانحہ 71ء کی بنیاد بھی اسی دور میں پڑی۔ ملک کے دونوں حصوں کے درمیان نفرت کے بیج بوئے گئے اور چھ نکات کی آبیاری کی گئی۔

72ء سے شروع ہونے والے عوامی دور نے 73ء کا متفقہ آئین اور قادیانیوں کو اقلیت قرار دینے کا کارنامہ انجام دیا۔ لیکن اپنے ہی آئین کو موم کی ناک بنانے والے اور تھوڑی سی پینے کا لاکھوں کے مجمعے میں اعلان کرنے والے کا انجام بہت عبرت ناک ہوا اور ایک مرتبہ پھر مارشل لاء گھٹاٹوپ اندھیرے کی طرح ملک پر چھا گیا۔ اس مرتبہ مارشل لاء اسلام کے نعروں کی گھن گرج میں آیا لیکن "ضیائی اسلام" نے معروف اور منکر کی تقسیم اپنے اقتدار کی مضبوطی اور

تقویت کے حساب سے کی۔ یعنی نماز روزہ پر خوب زور البتہ نہ عہد کا پاس نہ فحاشی سے اجتناب اور نہ ہی سود سے نجات۔ پھر یہ کہ ۸۵ء میں غیر جماعتی انتخاب کروا کر برادری پیشہ' غنڈہ گردی اور رسہ گیری کو منتخب ہونے کی اصل بنیاد بنا دیا اور محمد خان جونیجو کو یوں وزیراعظم مقرر کر دیا جیسے فیکٹری کا مالک منیجر کا تقرر کرتا ہے۔ آئین کو یوں توڑا مروڑا کہ نہ پارلیمانی' نہ صدارتی اور اراکین اسمبلی کی گردن پر انگوٹھا رکھ کر منظور کروایا۔ لہٰذا وزیراعظم اور صدر کے درمیان اختیارات کی رسہ کشی کا آغاز پہلے دن سے ہو گیا۔

اس کے بعد ۱۸ جولائی ۹۳ء تک بننے والی تمام حکومتیں اس رسہ کشی کی نظر ہوئیں کیونکہ بدقسمتی سے ضیاء الحق اپنے فوجی دستے کے ساتھ جب سفرآخرت پر روانہ ہوئے تب بھی ان کی جگہ ایک بیورو کریٹ نے لی۔ اس نے دو مرتبہ اسمبلیاں توڑنے کا نیا ریکارڈ قائم کیا۔ بے نظیر حکومت سے تو ان کے ایک دن کے لئے بھی تعلقات ٹھیک نہیں رہے اور کہنے والے کہتے ہیں کہ بے نظیر کو وزیراعظم بنانا حالات کا جبر تھا اور عوام کا وقتی طور پر منہ بند کرنا مقصود تھا اور رفت کا پروگرام آمد کے ساتھ ہی طے کر لیا گیا تھا۔ لیکن نواز شریف کا برطرف کرنا' جسے سیاسی طور پر پالا پوسا' جوان کیا اور اپنے ہاتھوں سے وزیراعظم ہاؤس جو اصلاً وزرائے اعظم کا میوزیم بن چکا ہے' میں اسے سجایا۔ لیکن اسلام آباد کی تیسری جنگ ان ہی دو کے درمیان لڑی گئی اور اس طرح لڑی گئی کہ پولیس رینجرز کے خلاف اور صوبے مرکز کے خلاف صف آراء ہو گئے۔ ملکی اور غیر ملکی تماش بینوں نے یہ جنگ بے ٹکٹ دیکھی۔ نواز اور اسحاق اتنی بے جگری سے لڑے کہ اپنی انا اور ذاتی اقتدار کے سامنے ملکی وجود' بقا اور سالمیت ثانوی حیثیت اختیار کر گئی۔ یار لوگوں نے اس میچ پر یوں کمنٹری کی "وہ مارا' وہ اسمبلی ٹوٹی' وہ جوڑ دی گئی' پھر ٹوٹی' میں صوبے ایڈمنسٹریٹر ہوں' میں پنجاب کا وزیراعلیٰ ہوں" گورنر ہاؤس میں مورچے کھودے گئے۔ کئی بیچارے جن کی شکل میاں اظہر سے ملتی تھی سیکٹریریٹ کے قرب و جوار میں چہل قدمی کرتے پائے گئے اور گرفتار ہوتے ہوتے بچے۔

غرض کہ جمہوریت کو وہ سبق سکھایا کہ اس کی نسلیں بھی یاد کریں گی البتہ اس مرتبہ فوج نے حیران کن رول ادا کیا۔ مارشل لاء کا سنہری موقعہ تھا لیکن انہوں نے حالات کے انتہائی موافق ہونے کے باوجود اس سے گریز کا فیصلہ کیا اور زور آور ریفری کا کردار ادا کرتے ہوئے انتخابات کا ڈول ڈلوایا اور یہ حقیقت ہے کہ غیر جانبدار نہ اور شفاف ہونے کے اعتبار سے یہ انتخابات ۷۰ء کے انتخابات کو بھی مات دے گئے۔ یہ بات بلا خوف تردید کہی جا سکتی ہے کہ ۹۳ء کے انتخابات کا معیار کسی طرح بھی یورپ کے کسی ملک سے کم تر نہ تھا۔

سوال یہ ہے کہ ہماری کشتی ہچکولے کیوں کھا رہی ہے اور ہر وقت یہ اندیشہ کیوں رہتا ہے کہ پانی کسی وقت مسافروں کے سروں پر سے گزر جائے گا۔ مختصر ترین جواب اس کا یہ ہے کہ ہمارے پاؤں کئی کشتیوں میں ہیں۔ اسلام مکمل ضابطہ حیات ہے اس کے کچھ اور تقاضے ہیں' معیشت اور معاشرت میں مغرب ہمارا پیشوا ہے۔ سیاست میں ہم جمہوریت کے شیدائی ہیں۔ لیکن آئین ہمارا نہ پارلیمانی ہے نہ صدارتی ہے۔ ہماری گھریلو زبان کچھ اور ہے ذریعہ تعلیم دوسری ہے۔ علوم دین اور دنیا دونوں اور ہی زبانوں میں ہیں۔ لہٰذا نظام حیات کے تمام گوشے ہی کنفیوژن کا شکار ہیں۔ ان سب آلام و مصائب کا ایک حل طویل المیعاد ہے اور ایک عارضی' فوری اور قلیل المیعاد ہے۔

طویل المیعاد حل تو یہ ہے کہ جس نظریہ کے تحت یہ ملک وجود میں آیا ہے اس کو حقیقی طور پر اصلی اور صحیح شکل میں نافذ کیا جائے۔ لیکن اس کے لئے طویل جدوجہد کی ضرورت ہے۔ اس اسلام کو انفرادی سطح پر اپنی ذات پر نافذ کیا جائے' ایک منظم جماعت کی تشکیل کی جائے' اس کے کارکنوں کی تربیت کی جائے جو غیر اسلامی رسوم و رواج کے خلاف کم از کم ذاتی سطح پر ڈٹ جائیں۔ قوت کو تدریجاً بڑھایا جائے۔ جب باطل نظام سے ٹکرانے کے قابل ہو جائیں تو وقت کے فرعونوں کو غرق کرنے کے لئے میدان میں نکل آئیں۔ قلیل المیعاد حل یہ ہے کہ جمہوری نظام گو مغرب سے درآمد شدہ ہے لیکن جو شے قرآن و سنت سے متصادم نہ ہو تو اسے اپنانے میں کوئی حرج نہیں۔ لہٰذا نہ پارلیمانی نظام غیر شرعی ہے نہ صدارتی۔ ان میں سے ایک کو مکمل طور پر اپنایا جائے۔ ایک ایسی پارلیمنٹ جو کروڑوں ووٹ لے کر وجود میں آتی ہے ایک شخص بیک جنبش قلم اسے نیست و نابود کر دیتا ہے۔ لہٰذا کوئی ایک طرز حکومت اختیار کیا جائے۔ البتہ صدارتی نظام حکومت اسلام کے مزاج سے زیادہ مناسبت رکھتا ہے۔ بہرحال اختیارات کی دوئی اگر کسی سطح پر بھی ہو گئی تو اس سے کبھی خیر برآمد نہیں ہو گا۔

صدارتی نظام کے خلاف یہ پراپگنڈا بالکل مضحکہ خیز ہے کہ اس سے چھوٹے صوبوں کی حق تلفی ہو گی اور پنجاب کی بالادستی قائم ہو جائے گی۔ سوال یہ ہے کہ پارلیمانی نظام میں جہاں وزیراعظم کا انتخاب ممبران اسمبلی کرتے ہیں' اس میں ۲۰۷ میں سے ۱۱۶ ممبران پنجاب سے منتخب ہوتے ہیں تو پارلیمانی نظام میں بھی تو پنجاب ہی کی بالادستی ہو گی۔ پھر یہ صوبے جن کی حد بندی انگریز نے کی تھی کیوں خدائی حکم کا درجہ پا گئے ہیں۔ ان کی مناسب تقسیم ہونی چاہئے۔ تاریخ پاکستان کا جو انتہائی مختصر خلاصہ اوپر کی سطور میں بیان کیا ہے اس سے ایک بات بڑی واضح طور پر سامنے آتی ہے کہ ہمارے بڑوں نے ملکی معاملات میں اصول پسندی اور قانون کی پابندی کی بجائے ہمیشہ نظریہ ضرورت کو ترجیح دی اور اپنے مفادات کو تحفظ دیا جو انتشار کا باعث بنتا رہا۔

لہٰذا اس ملک کا مستقبل اصلاً تو روشن اور تابندہ ہو سکتا ہے طویل المیعاد منصوبہ پر عمل درآمد کرنے سے لیکن یہ کہ جو نظام بھی فی الحال رائج ہے اسے اپنی ذاتی انا اور مفادات سے بلند تر ہو کر انصاف کے ساتھ اصول پسندی اور قانون کی پابندی کے ساتھ چلایا جائے تو استحکام نہ سہی بقا کو کوئی فوری بڑا خطرہ لاحق نہیں ہو گا۔○○

ڈاکٹر اسرار احمد
کی تالیف
● استحکامِ پاکستان ●
اشاعت خاص ○ اشاعت عام
مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور ۳۶-کے ماڈل ٹاؤن
فون: ۸۵۶۰۰۳

صدارتی نظام خلافت راشدہ کے نظام سے زیادہ قرب رکھتا

انقلاب کی منزل کا پرامن راستہ؟

ڈاکٹر طاہر القادری انقلاب کا ایک نیا لائحہ عمل تجویز کرتے ہیں

محترم پروفیسر ڈاکٹر طاہر القادری صاحب نے دین کے کام کا آغاز دروس قرآن اور تصنیف و تالیف سے کیا۔ اس کے بعد وہ تحریک منہاج القرآن کے پلیٹ فارم سے انقلاب کی گھن گرج کے ساتھ سامنے آئے۔ لیکن جلد ہی ان نعروں کا نتیجہ "پاکستان عوامی تحریک" کی شکل میں ظاہر ہوا۔ انتخابی سیاست کے میدان میں اتر کر اور ایک الیکشن میں ناکامی کا داغ دیکھنے کے بعد انہیں اپنی غلطی کا احساس ہوگیا۔ اب انہوں نے انقلاب کا ایک "پرامن راستہ" اپنایا ہے۔ جس کے خدو خال ان کے زیر نظر مضمون سے ظاہر ہیں جو روزنامہ پاکستان میں ۱۴ نومبر ۹۳ء کو شائع ہوا۔ ہم قارئین کرام کو دعوت فکر دیتے ہیں کہ کیا اس طرح باطل نظام کو جڑ سے اکھاڑنا اور اسلامی انقلاب برپا کرنا ممکن ہے؟؟...(ادارہ)

"تحریک منہاج القرآن" کا آغاز 1981ء میں ہوا جس کے تین بنیادی مقاصد متعین کئے گئے۔ 1۔ اصلاح احوال امت 2۔ تجدید واحیائے دین 3۔ غلبہ ونفاذ اسلام۔ پہلے دو مقاصد کے حصول کے لئے جدوجہد ادارہ منہاج القرآن کی صورت میں شروع کی گئی تیسرے مقصد کے حصول کے لئے 25 مئی 1989ء کو پاکستان عوامی تحریک کا قیام عمل میں لایا گیا۔ اس موقع پر ہم نے یہ بات برملا کہہ دی تھی کہ "ہم مروجہ پیشہ وارانہ نوعیت کی سیاست نہیں کرنا چاہتے ہمارا مطمح نظر یہ نہیں ہے کہ محض ہر الیکشن میں کھڑے ہوتے رہیں' چند سیٹیں لیں اور پریشر گروپ بنا کر مطمئن ہو جائیں۔ ہماری اصل منزل مصطفوی انقلاب ہے۔ ایک یا دو انتخابی معرکوں میں منزل کی طرف بڑھنے کی کوشش کریں گے' یہ راستہ اپنے مقصد کے لئے مفید نہ پایا تو راستہ تبدیل کر لیں گے۔" اس اعلان کی روشنی میں ہماری ذمہ داری تھی کہ 90ء اور 93ء کے انتخابات کے تناظر میں پاکستان کے سیاسی کلچر کا دیانتدارانہ جائزہ لیں اور اس امر کا تعین کریں کہ انتخابی ماحول اور سیاسی عمل کے ذریعے "اقامت دین" کی جدوجہد کا کیا مستقبل ہے؟ 1970ء کے انتخابات میں مذہبی جماعتوں کا گراف حاصل کردہ سیٹوں اور ووٹوں کے اعتبار سے اس قدر تھا کہ نہ کبھی اس سے قبل وہ پوزیشن حاصل کی جا سکی تھی نہ اس کے بعد اسے برقرار رکھا جا سکا۔ مگر وہ دور بھی نظام مصطفیٰ کے نفاذ کے سلسلے میں کسی مثبت پیش رفت کا باعث نہ ہو سکا۔ کیونکہ اسمبلی میں اس وقت بھی مذہبی جماعتوں کی نمائندگی مجموعی طور پر بہت کم تھی اور اب 93ء تک پہنچتے پہنچتے حالت یہاں تک گر گئی ہے کہ لیہ انتخابات میں تمام مذہبی جماعتیں مجموعی طور پر 3ء5 فیصد ووٹ حاصل کر سکی ہیں اور دو سو سے زائد سیٹوں پر مشتمل قومی اسمبلی میں ان کے کل 9 نمائندے پہنچ پائے ہیں۔ جب کہ اس اسمبلی میں غیر مسلم اقلیتوں کی نمائندگی بھی 10 سیٹوں پر مشتمل ہے۔ صوبائی اسمبلیوں میں صورت حال اس سے بھی ابتر ہے' مستزاد یہ کہ اس قدر مضحکہ خیز صورتحال بڑی مشکل سے کروڑہا روپے کے خرچ سے حاصل کی جا سکی ہے۔ پاکستان عوامی تحریک نے حالات کا ادراک کرتے ہوئے نہ صرف 93ء کے انتخابات سے لاتعلقی کا اعلان کر دیا تھا۔ اس وقت ہمیں دو مقاصد میں سے ایک کا انتخاب کرنا ہے۔ ایک یہ کہ مروجہ سیاسی اور انتخابی عمل میں فقط اس لئے اپنی جدوجہد جاری رکھیں کہ اس نظام میں ہمارا سیاسی وجود برقرار رہ سکے اور ہمارے کچھ لوگ ہمیشہ پارلیمنٹ میں اپنی غیر مؤثر آوازیں بلند کرتے رہیں اور سمجھتے رہیں کہ ہمیں سیاسی طور پر ایک نمائندہ حیثیت میسر ہے۔ دوسرے یہ کہ ہم سیاسی جدوجہد کا مقصد وحید صرف مصطفوی انقلاب اور غلبہ ونفاذ اسلام کو سمجھیں اور مروجہ سیاسی اور جمہوری عمل کو خالصتاً اس عظیم منزل کی طرف پیش رفت کا ذریعہ جانیں۔

ہم گہرے غور و فکر کے بعد اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ موجودہ سیاسی کلچر میں جمہوری اور انتخابی عمل سے صرف پہلا مقصد پورا ہو سکتا ہے اور مستقبل میں مذہبی جماعتوں کے لئے اس امر کی بھی کوئی ضمانت نہیں کیونکہ سیاسی عمل دو جماعتی نظام کی طرف بڑھتا نظر آ رہا ہے۔ اور شائد آئندہ مذہبی جماعتوں کو نہایت قلیل حد تک بھی نمائندگی حاصل کرنے کے لئے دونوں دھڑوں میں سے کسی ایک کے ساتھ وابستگی اختیار کرنی پڑے۔ جہاں تک اس راستے سے دوسرے مقصد کے حصول کا تعلق ہے اس کا دور تک بھی کوئی امکان دکھائی نہیں دیتا۔ ہم اپنی چار سالہ سیاسی اور انتخابی جدوجہد' گزشتہ 45 سالہ پاکستانی سیاست کے تجربات' موجودہ سیاسی کلچر اور اس کے کردار اور جمہوری نظام کے مقتضیات ونتائج کے تناظر میں اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ پاکستان عوامی تحریک آئندہ اس "مروجہ سیاسی اور انتخابی عمل" کو جاری رکھتی ہے تو نہ صرف یہ کہ اس راستے سے مصطفوی انقلاب اور غلبہ ونفاذ اسلام کا مقصد پورا نہیں ہو سکے گا بلکہ تحریک منہاج القرآن کے پہلے دو اصلاحی اور تجدیدی مقاصد بھی بری طرح متاثر ہوں گے۔ تحریک منہاج القرآن کو ابھی بہت کچھ کرنا ہے۔ اسی طرح عالم اسلام کی نوجوان نسل کے لئے تحریک نے قرآنی علم و فکر کے عصری تقاضوں کے مطابق فروغ' اسلام کے فقہی

فکر میں تحقیق واجتہادی ارتقاء کی بحالی' دینی تعلیم کی عقلی اور سائنسی تعبیر وتوجیہہ حضور نبی اکرم ﷺ سے تعلق وعشق کے استحکام اور اسلام کے روحانی پہلوؤں کی عملی تبلیغ کے حوالوں سے نمایاں تجدیدی خدمات انجام دی ہیں اور اس جدوجہد کو منزل تک پہنچانے کے ابھی بہت سے مراحل باقی ہیں۔ اصلاح احوال امت اور تجدید واحیائے دین کے ان دونوں کاموں کو تسلسل اور کامیابی سے آگے بڑھاتے رہنے کے لئے ضروری ہے کہ تحریک کا فکری اور عملی تشخص مجروح نہ ہو اور اس کے دینی کردار پر بھی آنچ نہ آئے۔ ہمیں تحریک کی انقلابی جدوجہد کو نتیجہ خیز حد تک آگے بڑھانا ہے اور ساتھ ہی ساتھ اس کے اصلاحی وتجدیدی کام کو بھی بھرپور انداز سے جاری رکھنا ہے' تب ہی ہم اس ہمہ جہت جدوجہد کے ذریعے مصطفوی انقلاب اور احیائے اسلام کی عالمگیر منزل کی طرف بڑھ سکتے ہیں۔ پاکستان عوامی تحریک بھی چونکہ تحریک منہاج القرآن کے بنیادی مقاصد میں سے ایک مقصد کی تکمیل کے لئے قائم کی گئی ہے اس لئے ہم سیاست پر اپنی تحریک کے بنیادی دینی کردار پر نظریاتی انقلابیت قرآنی اور مصطفوی سیاست اور اسلامی انقلاب کے لئے کئی نئے راستوں کو ترجیح دیتے ہیں۔ مغربی طرز سیاست میں منزل کی طرف انتخاب کے علاوہ اور کوئی راستہ نہیں جاتا مگر مصطفوی طرز سیاست میں منزل کی طرف انتخاب کے علاوہ اور بھی کئی پرامن راستے ہو سکتے ہیں' ہم انشاء اللہ مصطفوی انقلاب کے لئے ان پرامن راستوں پر چل کر اپنی منزل کو پائیں گے۔ لہٰذا ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ پاکستان عوامی تحریک آئندہ مصطفوی انقلاب کی جدوجہد غیرسیاسی اور غیرانتخابی طریق پر انجام دے گی اور سیاسی نظام کا حصہ بننے کی بجائے ملک میں تعلیم اور سماجی انقلاب بپا کرے گی تاکہ قوم کو تعلیم کے زیور سے آراستہ کر کے شعوری پسماندگی سے نجات دلائی جا سکے۔ موجودہ حالات میں ملک کے مروجہ نظام میں بہتری آسکتی ہے نہ نفاذ اسلام ممکن ہے اور نہ ہی ملک میں حقیقی جمہوریت قائم ہو سکتی ہے جب تک کہ قومی شرح خواندگی میں اضافہ کر کے تعلیمی اور شعوری انقلاب بپا نہیں کیا جاتا۔ ہم پوری دنیا کی بات نہیں کرتے صرف جنوبی ایشیا کے ممالک کی نسبت پاکستان میں شرح خواندگی شرمناک حد تک کم ہے۔ مختلف اداروں کے اعداد وشمار کے مطابق پاکستان میں تعلیم یافتہ افراد کی شرح صرف 5 تا 20 فیصد ہے۔ یعنی پاکستان کے 100 میں سے 80 تا 95 شہری غیر تعلیم یافتہ اور اپنی ملی وقومی ذمہ داریوں کے شعور سے ناآشنا ہیں۔ لہٰذا ہم عزم کرتے ہیں کہ آئندہ چند برس کے دوران اپنے تنظیمی جال کے ذریعے ملک میں ایک ایسا سماجی اور تعلیمی انقلاب بپا کر دیں گے جسے عوام دیکھ سکیں گے اور محسوس کریں گے۔ اس سلسلے کے پہلے مرحلے میں آئندہ تین برسوں میں ملک بھر میں دس ہزار سے زائد عوامی تعلیمی مراکز قائم کئے جائیں گے جن میں پاکستان عوامی تحریک اور یوتھ لیگ کے ایک لاکھ نوجوان ایک کروڑ سے زائد افراد کو زیور تعلیم سے آراستہ کریں گے۔ ہم اپنے محدود وسائل کے ساتھ اس تعلیمی جہاد کا اعلان کرتے ہیں اور پرامید ہیں کہ پوری قوم سیاسی وابستگیوں سے بالاتر ہو کر ہمارے ساتھ شریک جہاد ہوگی' ہر تعلیم یافتہ فرد کا یہ ملی اور قومی فریضہ ہے کہ تین تین ماہ کے لئے عوامی تعلیمی مراکز میں رضاکارانہ طور پر تدریسی خدمات پیش کرے اور اپنے کوائف تحریک منہاج القرآن کے قریبی ضلعی دفاتر یا مرکزی سیکرٹریٹ کو فوری طور پر ارسال کرے۔ یہاں یہ وضاحت کرنا بھی بے جا نہ ہوگا کہ ہم پاکستان کا استحکام بقاء وسلامتی' تعمیر وترقی' سماجی انصاف' انسانی حقوق کے تحفظ اور اسلامی معاشرے کے قیام کے لئے جدوجہد جاری رکھیں گے۔ اس سلسلے میں کسی بھی حکومت کے مثبت اقدامات کی تائید کریں گے اور غلط اقدامات کی اصلاح کے لئے رہنمائی کرتے رہیں گے۔

KHALID TRADERS

IMPORTERS – INDENTORS – STOCKISTS & SUPPLIERS OF WIDE VARIETY OF BEARINGS, FROM SUPER – SMALL TO SUPER – LARGE

AUTHORIZED AGENTS NTN BEARINGS

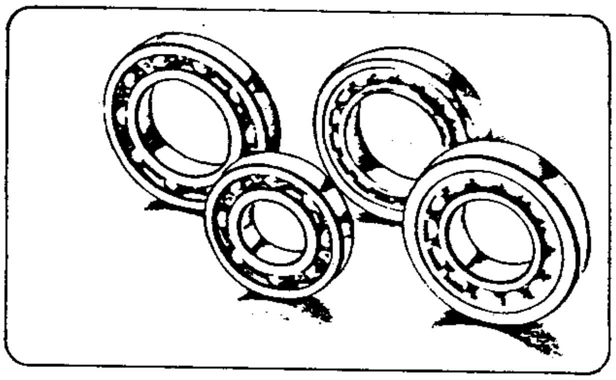

PLEASE CONTACT

TEL : 7732952-7735883-7730593
G.P.O. BOX NO. 1178, OPP KMC WORKSHOP
NISHTER ROAD, KARACHI-74200 (PAKISTAN)
TELEX : 24824 TARIQ PK CABLE : DIMAND BALL FAX : 7734776

FOR AUTOMOTIVE BEARINGS : Sind Bearing Agency 64 A-65, Manzoor Square Noman St. Plaza Quarters Karachi-74400 (Pakistan)
Tel : 7723358-7721172

LAHORE : (Opening Shortly) — Amin Arcade 42, Brandreth Road, Lahore-54000 Ph : 54169

GUJRANWALA : — 1-Haider Shopping Centre, Circular Road, Gujranwala Tel : 41790-210607

WE MOVE FAST TO KEEP YOU MOVING

پاکستان کے امیج کو خراب کرنے اور اسے دہشت گرد قرار دینے کی کوششیں عروج پر ہیں!

مغربی سرمایہ دارانہ نظام کی چمک نے روسیوں کی نگاہوں کو خیرہ کر دیا!

لینن گراڈ (روس) سے ایک تحریکی ساتھی کا چشم کشا مکتوب' ناظم حلقہ لاہور کے نام!

محترمی غازی وقاص احمد صاحب' السلام علیکم ورحمہ اللہ

آج جبکہ میں جس ماحول سے آپ کو یہ خط تحریر کر رہا ہوں وہاں آپ رفقاء کی مجلس بہت یاد آتی ہے۔ اور اس میں شدت اور ا یکدم اس وقت اور بڑھ جاتی ہے جب یہاں کے ماحول کا سیاہ پردہ اچانک نظروں کے سامنے آ جاتا ہے جو کہ عام حالات میں ازحد چمکدار اور خوشنما اور دلفریب بھی ہے۔ اور اس سے مایوسی یک دم اسی طرح پیدا ہوتی ہے جس طرح کوئی بچہ گرم چیز کو چھو لینے کے بعد یک دم پیچھے ہٹتا ہے۔ وگرنہ تجسس اور مطالعہ سے تو انسان کی زندگی عبارت ہے۔

میں لینن گراڈ (پیٹرز مرگ) میں ایک یونیورسٹی میں کیمیکل انجینئرنگ کا طالب علم ہوں اور آج کل چونکہ چھٹیاں ہیں لہٰذا یہاں اس شہر میں آیا ہوا ہوں۔ لینن گراڈ ایک بڑا اور خوبصورت شہر ہے۔ شہر ساحل سمندر پر واقع ہے اور ساحل سمندر کی زندگی بھی اپنی تمام قباحتوں کے ساتھ یہاں موجود ہے۔ شہر کے سنٹر میں ہماری یونیورسٹی واقع ہے اور ہوسٹل سے تقریباً ۲۰ کلو میٹر کے فاصلے پر ہے۔ میٹرو موجود ہے اور ٹرانسپورٹ کا وسیع نظام ہے۔ لہٰذا کوئی دقت نہیں ہوتی۔ شہر انتہائی صاف ستھرا ہے۔ اس کی آبادی تقریباً ۶۰ لاکھ کے قریب ہے اب جبکہ یو۔ایس۔ایس۔آر مکمل طور پر ختم ہو چکا ہے' ایک ملک کی جگہ ۱۵ نئے ملک بن چکے ہیں۔ اور سرحدیں اور سرحدی تنازعے اٹھ کھڑے ہوئے ہیں' ویزے اور ویزے کی پابندیاں سامنے آ رہی ہیں۔ اس شہر گروڈنا میں آنے کے لئے جو کہ دوسری ریاست بیلورشیا میں واقع ہے' اب ۶۰ ڈالر کا ویزا لینا پڑتا ہے۔ لات انتہائی تیزی سے تبدیل ہو رہے بلکہ ہو چکے ہیں۔ پہلے ماسکو تا کراچی ٹکٹ ایک طالب علم کے لئے ۱۵۰ ڈالر کا تھا اور اب ۱۲۰۰ ڈالر کا ہے۔ اور وقت کی رفتار ان لوگوں کی چال سے زیادہ تیز ہو چکی ہے۔ اور یہ وقت لوگوں کے لئے مصائب اور آلام کا ایک انبار لئے ہوئے ہے۔ مہنگائی میں ہزاروں فی صد اضافہ ہو چکا ہے۔

اب جب کہ کیمونزم ختم ہو چکا ہے اور سرمایہ داری کا ظالمانہ نظام اپنے پنجے گاڑ رہا ہے اور ابھی تک تو چونکہ صرف اسکی نعمتیں سامنے آ رہی ہیں' لہٰذا اس کی تعریف میں حکمران طبقہ زمین و آسمان ایک کر رہا ہے۔ اور جو اس کی نعمتوں کے متعلق فکرمند ہیں وہ آنے والے طوفان کے خلاف سراپا احتجاج ہیں' مگر بے بس ہیں۔ اس گروہ کی اکثریت ملک کی غریب آبادی پر مشتمل ہے۔ کیونکہ کیمونزم کے خاتمے سے سب سے برا اثر اس طبقے پر پڑا ہے۔ اور آج مجھے بھی کچھ ایسا ہی محسوس ہوتا ہے کہ سرخ انقلاب کے نعرے بلاوجہ ہی پرکشش نہ تھے' ان میں کچھ نہ کچھ حقیقت ضرور تھی کہ اس میں لاکھوں طالب علم مفت پڑھ کے چلے گئے۔ واقعتاً انہیں یہ سہولت دنیا کے اور کس خطے میں نصیب ہوئی' وہ کیمونزم کے راگ نہ الاپیں تو اور کیا کریں! بہرحال اب حالات تبدیل ہو چکے ہیں اور سرخ سویرا ہمیشہ کے لئے غروب ہو چکا ہے۔ خوف اور دہشت کی فضا اب معدوم ہو چکی ہے اور اب یہاں آزادی اظہار اور جمہوریت کے راگ الاپے جا رہے ہیں۔ امریکہ اور یورپ کی چکاچوند نے ان لوگوں کو اس قدر مرعوب کر دیا ہے کہ آنکھیں چندھیا کر رہ گئیں ہیں۔ افغانستان کی شکست سے ان لوگوں کے حوصلے اس قدر پست ہو کر رہ گئے ہیں کہ اب پانی کو دیکھ کر بھی ڈرتے ہیں۔ پاکستان کے متعلق یہاں ایک طاقتور اور امیر ملک ہونے کا تاثر نہایت عام ہے' جو کہ ہماری کمزور سفارتی مہم کے باعث دن بدن کم ہو رہا ہے۔ اور صرف مسلمان ریاستوں پر توجہ دی جا رہی ہے۔ یہاں یورپ کے قلب سے قریب تر واقع ریاستوں بیلو رشیا' یوکرائن اور بالٹک ریاستوں سے تعلقات کی طرف کوئی توجہ نہیں۔ جبکہ انڈیا ان علاقوں میں اپنے سفارتی تعلقات تیزی سے بڑھا رہا ہے۔ اور اب یہاں پاکستان کے متعلق پروپیگنڈا نہایت شدت اختیار کر چکا ہے۔ جب بھی کہیں اسلحہ اور نارکوٹکس پکڑی جاتی ہیں' پاکستان کا نام کام آجاتا ہے۔ یوگوسلاویہ میں پاکستان کے کردار کو نہایت بڑھا چڑھا کر پیش کیا جا رہا ہے۔ اور اسے ایک دہشت گرد ملک ثابت کرنے کی ہر ممکن کوشش ہو رہی ہے۔

یہاں پر ایک طبقہ ایسا بھی ہے جس کو آپ NEW RUSSIANS کہہ سکتے ہیں۔ ان کے لئے یہ ہی اصطلاح وضع ہو چکی ہے۔ اس طبقے کے پاس روپے کی فراوانی اور اختیارات لامحدود ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو کیمونزم میں اعلیٰ عہدوں پر فائز رہے۔ لہٰذا اب یہ اپنی شاہانہ امارت کے باعث آگے آگے ہیں۔ بلاشبہ نئے روس کی تہذیب و ثقافت کے علمبردار ہیں۔ اس وقت کا روس اپنے بدترین دور سے گزر رہا ہے۔ حکمران کٹھ پتلی بنے ہوئے ہیں اور عوام غربت کی چکی میں پس رہے ہیں۔ اور کچھ سمجھ نہیں آتا کہ آخر کیا ہو رہا ہے۔ معاشی صورتحال یہ ہے کہ روبل جو کبھی ڈالر کے برابر تھا' اتنا بے وقعت ہو چکا ہے کہ آج ۱۲۰۰ روبل ایک ڈالر کے برابر ہیں۔ لہٰذا عوام چیخ رہے ہیں۔ اور مزید یہ کہ نو آزاد ریاستوں نے روس سے اپنے مطالبے منوانے شروع کر دیئے ہیں۔ ان میں بالٹک ریاستیں پیش پیش ہیں اور ان کا پشت پناہ پورا یورپ ہے۔ جو روس کے کسی بھی انتقامی ردعمل کے خلاف سراپا احتجاج بن جاتا ہے اور مختلف صورتوں

میں روس کو گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کر دیتا ہیں۔ یہ وہ باتیں ہیں جس سے آپ بلکہ ہماری قوم بخوبی واقف ہے۔ بلاشبہ روس کی حالت اس وقت ایسے زخمی سانپ کی مانند ہے جو پھنکارنے کے سوا اور کچھ بھی نہیں کر سکتا۔ اور جس پر چیونٹیوں کے لشکروں نے حملہ کر دیا ہو۔ افغان ضرب ایسی کاری ثابت ہوئی ہے کہ اس نے پورے شرق و غرب کو ہلا کر رکھ دیا ہے۔ یہاں اکثر بسوں پر روسی زبان میں ایک عبارت لکھی نظر آتی ہے جس کا ترجمہ یہ ہے کہ : "افغانستان ہمارا درد ہے"

یہ اس امر کی غمازی کرتا ہے کہ تاریخ میں کیا بھونچال رونما ہو چکا ہے۔ مگر افسوس کہ ہماری عوام اور حکومت دونوں اس امر سے ناواقف اور لاعلم ہیں کہ وہ کس قدر شاندار کارنامہ سرانجام دے کر تاریخ میں امر اور سرخ رو ہو چکے ہیں اور ان کے ماتھے پر فتح کا وہ مبارک نشان موجود ہے جو کہ آج دھندلا چکا ہے۔ لیکن مجھے امید قوی ہے کہ مستقبل کا مورخ ہمارے اس شاندار کارنامے کو گوہر نایاب کی مانند دنیا کے سامنے فروزاں کر دے گا۔ بہرحال میں یہ ضرور کہوں گا کہ آج بحیثیت ایک قوم کے ہم جس ذلت اور پستی کا شکار ہیں تاریخ کا یہ انوکھا واقعہ اس سے نجات کے لئے ایک کارگر مہمیز کا کام دے سکتا تھا۔ مگر افسوس کہ ہم نے اپنی جہالت کے باعث اس موقع کو گنوا دیا اور آج جو ہماری ملکی صورتحال ہے اس کے پیش نظر مجھے خوف محسوس ہوتا ہے کہ شاید مورخین مستقبل میں ہمیں بھی اہل بغداد اور اہل غرناطہ کی صف میں نہ لا کھڑا کریں۔ یورپ کی جو کچھ بھی سائنسی اور مادی ترقی ہے آج اس سے فیض یاب ہونے کا ہمارے پاس کوئی موقع نہیں ہے۔ یورپ نے اپنے تمام وسائل و ذرائع کا رخ اب اس شکستہ روس کی طرف موڑ دیا ہے۔ اور اس سرخ ریچھ کو پنجرے میں بند کر لینے کے پورے پورے انتظامات کر لئے گئے ہیں۔ جس کے بعد مداری اپنے کرتب دکھا سکے گا۔ اخلاقی زوال کے تمام تر پہلو بلاشبہ یہاں پہلے ہی بقیہ یورپ کے طرز پر ہیں' شاید اس سے آگے ہیں۔ شراب جس قدر سستی یہاں دستیاب ہے۔ باقی دنیا میں نہ ہوگی اور پھر اس پر مستزاد حسن اور خوبصورتی' جس میں ان کا کوئی ثانی نہیں۔ بڑے بڑے کلب اور ڈسکو ہیں جہاں تفریح کے لئے خرچ برائے نام ہے۔ اب منیلا اور بنکاک جانے والوں کا مستقر یہ سرزمین بن رہی ہے۔ تقریباً ۲۵ ہزار پاکستانی اس وقت ماسکو میں پڑاؤ ڈالے ہوئے ہیں جن کے خوابوں کی سرزمین جرمنی اور بقیہ یورپ ہے۔ لٹے پٹے اور شکستہ چہروں والے لیکن پر عزم یہ نوجوان اپنے اچھے مستقبل کی خاطر برف کی اس سنگلاخ زمین پر بسیرا کرنے پر مجبور ہیں۔ ان کی یہاں موجودگی ہماری اقتصادیات کے مکروہ چہرے پر سے وہ پردہ بھی اٹھا دیتی ہے جسے ہمارے سیاست دانوں اور راہنمایاں قوم نے اپنے مکر و فریب سے سجایا ہوا ہے اور نیچے سے بر آمد ہونے والے ہڈیوں کے خول میں دستیاب آنکھوں کی بجائے دو دائرے نما سوراخ چیخ چیخ کر یہ سوال کرتے ہیں کہ کب ڈھلے گی ظلم کی یہ رات! اور کب پھیلے گی نور کی صبح! جس کا جواب یہاں کسی کے پاس بھی نہیں۔ اس اعتراف کے باوجود کہ میں اب عملاً آپ کا ہم سفر اور رفیق نہیں رہا' آپ کی وساطت سے سالار قافلہ سے یہ گزارش کرتا ہوں کہ اب مشعلیں تیز کرنے اور قدم تیز اٹھانے کی ضرورت ہے۔ امیر تنظیم اسلامی محترمی ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں ازحد سلام۔ والسلام

مخلص

طارق افضل

گروزنا۔ (بیلو رشیا)

پھر یاد کرو وحدت کا سبق

کیوں بھول گئے یلغاروں کو
لرزاتے تھے کہساروں کو

خود ریزہ ہو کر بکھر گئے
اب زنگ لگا تلواروں کو

پھر یاد کرو وحدت کا سبق
پڑھ لو قرآن کے پاروں کو

ناکام بنا دو مل جل کر
ان ظلم کے ٹھیکداروں کو

تم آپس میں کیوں لڑتے ہو
کیوں چھوڑ دیا مکاروں کو

طوفان بنو جو رک نہ سکے
کر لو یکجا سب دھاروں کو

بابر کی مسجد بوزنیا
دیکھو ٹوٹے میناروں کو

اے عمر جگاؤ اب تم ہی
اس قوم کے نیند کے ماروں کو

عمر برناوی

بقیہ : خواتین کے مسائل

اپنے گھروں میں بیٹھ کر باعزت طور پر سلائی وغیرہ کا کام کر کے باعزت روزی کما رہی ہیں۔ عورتوں کے لئے الگ زنانہ ہسپتال قائم کئے جا سکتے ہیں جہاں عورتیں ہی مریضہ ہوں' عورتیں ہی ڈاکٹر ہوں اور عورتیں ہی نرس ہوں۔ غرضیکہ اس قسم کے ادارے قائم کئے جا سکتے ہیں جن کا انتظام و انصرام عورتیں چلاتی ہوں۔ عورتوں کی الگ اسمبلیاں قائم کی جا سکتی ہیں جہاں عورتیں عورتوں ہی کے ووٹ سے منتخب ہو کر آئیں اگر ہمارے ہاں صوبائی اور قومی سطح پر اسمبلیاں اور سینیٹ کام کر سکتے ہیں تو ایک عورتوں کی اسمبلی میں اضافے سے کون سا فرق پڑ جائے گا بلکہ عورتوں کو امور مملکت میں اپنی شرکت کا احساس بھی پیدا ہو گا۔ یہ سب کام شریعت کے دائرے کے اندر رہتے ہوئے ہو سکتے ہیں۔ ضرورت صرف نیک نیتی کی ہے۔ لیکن ہمارا حال تو یہ ہے کہ ہم نے عورت کو ایک کاروباری جنس بنا رکھا ہے۔ ہر اشتہار میں اس کی موجودگی ضروری ہے چاہے ریڈیو ہو ٹیلی ویژن ہو یا اخبارات چاہے اس پروڈکٹ سے جس کا اشتہار دیا جا رہا ہے عورتوں کا سرے سے کوئی تعلق ہی نہ ہو۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ کام ملک میں قائم موجودہ نظام کے تحت نہیں ہو سکتا اس نظام میں خوف خدا اور فکر آخرت کا عنصر سرے سے موجود نہیں۔ اس کے لئے تو اسلام کا نظام عدل و قسط قائم کرنا پڑے گا جس کی جھلک ہمیں خلافت راشدہ میں نظر آتی ہے۔ اور یہ نظام ملک میں رائج نظام انتخابات کے ذریعہ ممکن نہیں۔ اس کے لئے تو ہمیں انقلاب کا راستہ اختیار کرنا پڑے گا' رہنمائی ہمیں نبی اکرم ﷺ کی سیرت مطہرہ سے حاصل کرنا پڑے گی۔ تمدنی ارتقاء سے پیدا شدہ مسئلوں سے نمٹنے کے لئے ہمیں اجتہاد کا راستہ اختیار کرنا پڑے گا۔ شاید اللہ تعالیٰ کو ہمارے حال پر رحم آ ہی جائے کہ ملک کے عوام میں نظام خلافت کی برکات کا شعور پیدا کرنے والی کوئی منظم جماعت وجود میں آ جائے جو لوگوں کے دلوں میں اس نظام کی تڑپ پیدا کر سکے اور اسلامی انقلاب کی راہ ہموار ہو سکے۔

بقیہ : نقطہ نظر

کی بنیاد بنا لیا ہے"۔ کیا ہماری مذہبی جماعتیں یہی کچھ نہیں کر رہیں؟ اندریں حالات مذہبی جماعتوں کا جو ووٹ تھا وہ بھی کئی خانوں میں تقسیم ہو گیا۔ لہٰذا ان کا (یعنی مذہبی جماعتیں) بطور دوسری پارٹی کے سامنے آنے کا کوئی سوال ہی نہیں ہے۔ ان حالات میں قاضی حسین احمد صاحب کی یہ بات ہمارے نزدیک سو فیصد درست ہے کہ مستقبل میں جماعت اسلامی یا اسلامک فرنٹ جو بھی نام دے لیں متبادل قیادت کے طور پر ابھرے گا۔ لیکن یہ سوال باقی رہ جاتا ہے کہ حالیہ انتخابات میں جماعت کیوں بری طرح ناکام ہوئی۔ ہمارے نزدیک اس کا اصل سبب یہ ہے کہ حالیہ 23 برس کی تاریخ میں جماعت کا سارا زور منفی اتحادوں کا ساتھ دینے میں صرف ہوا۔ اور اس غلطی کا احساس تو اب جماعت کے اکابرین کو بھی ہوتا جا رہا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ جماعت نے چھوٹی برائی اور بڑی برائی کے چکر میں بہت کچھ کھو دیا' اپنی تمام توانائیاں انٹی پیپلز پارٹی سٹینڈ پر ضائع کر دیں۔ اس کا نتیجہ حالیہ انتخابات کے دوران سامنے آ گیا۔ جماعت کا اپنا ووٹ بھی مسلم لیگ کو ہی ملا۔ اس المیہ کے باوجود ہم سمجھتے ہیں کہ قاضی صاحب کا استدلال سو فیصد درست ہے۔ لیکن اس بات کو مکمل طور پر سمجھنے کے لئے سارے معاملے کو بین الاقوامی تناظر میں دیکھنا ہو گا۔

اس سلسلے میں یہ بات انتہائی اہمیت کی حامل ہے کہ سوویت یونین کی شکست وریخت کے بعد دائیں بائیں بازو کا معاملہ تو بالکل ختم ہو چکا ہے۔ اب تو دنیا واضح طور پر دو کیمپوں میں منقسم نظر آتی ہے۔ ایک وہ گروہ جو اس وقت بظاہر غالب ہے۔ آپ انہیں لبرل کہہ لیں یا سیکولر یا Moderate۔ دوسرا مذہبی طبقہ ہے جنہیں آج کی اصطلاح میں بنیاد پرست بھی کہا جاتا ہے۔ لہٰذا اب پاکستان میں بھی جو صف بندی ہو گی وہ بھی انہی دو حوالوں سے ہی ہو گی۔

ان حقائق کی بنیاد پر قاضی صاحب کا یہ خیال مبنی بر حقیقت ہے کہ وہ مستقبل کی متبادل قیادت ہیں۔ کیونکہ یہی وہ واحد دینی جماعت ہے جو ایک نظم اور فکر کے تحت کام کرنے کی اہلیت رکھتی ہے۔ لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا اس طرح اقامت دین کی وہ جدوجہد کامیابی کی منزل کی طرف بڑھے گی جو جماعت کے قیام کی اصل بنیاد ہے۔ اس کا جواب یقیناً نفی میں ہے۔ اس کے لئے تو ہمیں اسی طریقے کی طرف لوٹنا ہو گا جو نبی اکرم ﷺ کا طریقہ مبارک تھا۔ اس کے لئے ہمیں رہنمائی سیرت نبوی اور قرآن حکیم کے سوا اور کہیں سے بھی نہیں مل سکتی۔ یہاں یہ بھی گزارش ضروری ہے کہ قرآن پاک کا صحیح ادراک سیرت نبوی کو سمجھے بغیر حاصل نہیں ہو سکے گا۔ کاش ہماری دینی اور مذہبی جماعتیں اس بات کو سمجھ لیں۔

بقیہ : آں غزل

زندگی کے تمام شعبوں میں انگریز کے دیئے ہوئے نظام کو من وعن اختیار کر لیا تھا چنانچہ اب اصل ضرورت نظام کو بدلنے کی تھی نہ کہ محض انتظامی ہاتھ تبدیل کرنے کی۔ اس کام کے لئے مطالباتی اور احتجاجی سیاست ہی مفید ثابت ہو سکتی تھی اور فی الوقت جماعت کو جو کسی قدر کامیابی نصیب ہوئی وہ اسی ذریعے سے ہوئی' انتخابی سیاست میں حصہ لینا ہرگز مفید مطلب نہیں ہو سکتا تھا اور نہ ہوا۔

محترم میاں صاحب نے یہ بات کہی ہے کہ ڈنڈے کے زور سے اسلام نہیں لیا جا سکتا بلکہ اس کے لئے تطہیر افکار بذریعہ دعوت و تبلیغ کی ضرورت ہے۔ ہم ان کی اس بات کو مانتے ہیں۔ ہمارا موقف بھی یہی ہے کہ پہلے معاشرے میں ایک "collective will" پیدا کرنے کی ضرورت ہے وہ مسلمان مرنے اور مسلمان جینے کا ایک اجتماعی ارادہ کر لیں۔ لیکن یہ اجتماعی ارادہ کیسے پیدا ہوتا ہے اور انقلاب کے لئے کن مراحل کو طے کرنا پڑتا ہے اس کا ایک پورا منہاج ہے جو ایک مکمل مضمون کا متقاضی ہے۔ بہرحال اگر بقول میاں صاحب کوئی انقلابی نہج اختیار کرنے کے بجائے ضرورت صرف حکومت چلانے والے ہاتھ بدلنے کی ہے' اور ہاتھ بدلنے کے لئے ظاہر ہے کہ مروجہ نظام اور طریق کار کے مطابق الیکشن ہی واحد ذریعہ ہیں تو پھر بلا تکلف قاضی حسین احمد صاحب کی حالیہ انتخابی مہم کی بھرپور تائید و حمایت ہونی چاہئے تھی۔ آخر یہ سب کچھ قاضی صاحب نے عوامی حمایت حاصل کرنے کے لئے ہی تو کیا تھا۔ اگر آپ عوامی حمایت کے حصول کے لئے درجہ بدرجہ اپنے اصولوں کو قربان کر رہے تھے اور قاضی صاحب نے ایک ہی بار جھٹکا کر کے اس عمل کو اپنے منطقی انجام تک پہنچا دیا تو اس میں قاضی صاحب کو دوش دینا اور مورد الزام ٹھہرانا چہ معنی دارد؟------ میاں صاحب اگر ٹھنڈے دل سے غور کریں تو دیوار پر لکھی ہوئی یہ حقیقت انہیں بھی دکھائی دینے لگے گی کہ سب کچھ اصلاً اس ایک غلطی کا نتیجہ ہے جو قیام پاکستان کے بعد جماعت کی قیادت سے سرزد ہوئی کہ اس نے الیکشن کی سیاست میں کودنے کا فیصلہ کیا اس لئے کہ یہ بات اب تک ناقابل تردید حقیقت کا درجہ رکھتی ہے کہ یہ راستہ اس منزل کی طرف جاتا ہی نہیں جسے اپنا ہدف مان کر جماعت اسلامی نے اپنے سفر کا آغاز کیا تھا۔ OO

معنی ہی نہیں مضحکہ خیزبات ہے۔ اس لئے کہ جو ملک بنا ہی دو قومی نظریئے کی بنیاد پر ہو اور جس کا ہر رکن اسمبلی یہ حلف اٹھاتا ہو کہ وہ اسلامی آئیڈیالوجی کو فروغ دینے اور اس کے تحفظ کی ہر ممکن کوشش کرے گا اس کے قانون ساز ادارے میں غیر مسلموں کی شمولیت چہ معنی دارد؟ ہاں انتظامی امور میں ان کو شامل کرنے اور ان کی صلاحیتوں سے فائدہ اٹھانے میں ہرگز کوئی مضائقہ نہیں۔

لیکن پارلیمانی نظام حکومت میں چونکہ حکومت سازی اور قانون سازی دونوں کام پارلیمنٹ انجام دیتی ہے اور اس میں غیر مسلم بھی شریک ہوتے ہیں اس لئے یہ معاملہ گڈمڈ رہتا ہے۔ اس لحاظ سے صدارتی نظام فطری، منطقی اور خلافت راشدہ کے قریب تر ہونے کے سبب ہمارے لئے موزوں ترین نظام ہے۔ جس میں مقننہ اور انتظامیہ جدا جدا ہوتے ہیں اور اس میں غیر مسلموں کی حکومت میں شمولیت کا مسئلہ باسانی حل ہو سکتا ہے کہ انتظامیہ میں تو انہیں شامل رکھا جائے یہاں تک کہ فنی شعبوں میں وزراتیں بھی انہیں سونپی جاسکتی ہیں لیکن مقننہ میں ان کی شمولیت ہر اعتبار سے خلافت عقل و منطق ہے۔ صدارتی نظام کے حق میں بھی نواز شریف صاحب دبے الفاظ میں بات کر چکے ہیں لیکن اگر وہ اسے زیادہ موزوں تصور کرتے ہیں تو کھل کر اس کا اظہار کرنا چاہئے۔

ڈاکٹر اسرار احمد نے قاضی حسین احمد صاحب کے ایک اخباری بیان کے حوالے سے کہا کہ اگر قاضی صاحب کی یہ اطلاع درست ہے کہ حکومت امریکی ماہرین سے پاکستان کے جوہری پروگرام کے معائنے پر آمادہ ہو چکی ہے تو ملکی و قومی اعتبار سے یہ امر خودکشی کے مترادف ہوگا اور اس کی پر زور مزاحمت ہو جانی چاہئے نیز چوکنا رہنا چاہئے، کہیں حکومت اسلام کے بارے میں ہونے والی پیش رفت کو بھی امریکہ کے کہنے پر 'رول بیک' نہ کردے۔ انہوں نے زور دے کر کہا کہ مارچ ۱۹۴۹ء میں قرارداد مقاصد کی منظوری اور اب باقاعدہ دستور کا حصہ بن جانا ایک معجزہ سے کم نہیں۔ جس کے بعد یہ ہماری عدالت عظمیٰ پر منحصر ہے کہ وہ اس ضمن میں قانونی پیچیدگیاں دور کر کے عملی رہنمائی فراہم کرے۔

☆
☆ ☆

رفقاء و احباب نوٹ فرمالیں!

تنظیم اسلامی حلقہ غربی پنجاب میں

مبتدی تربیت گاہ

۱۰ تا ۱۶ دسمبر ۱۹۹۳ء

دفتر تنظیم اسلامی، صادق مارکیٹ، فیصل آباد میں منعقد ہوگی

نوٹ : تربیت گاہ کا آغاز ۱۰ دسمبر کو نماز عصر کے ساتھ ہوگا، ان شاء اللہ

قرآن کالج کے فارغ التحصیل طلبہ کے لئے

ایک اہم اطلاع

○ پاکستان کے ایک صنعتی ادارے اور ایک تجارتی ادارے نے قرآن کالج سے بی اے پاس کرنے والے طلبہ کو اس بنیاد پر کہ ان طلبہ نے دنیوی تعلیم کے ساتھ ساتھ دینی تعلیم بھی حاصل کی ہے، ملازمت میں ترجیح دینے کا فیصلہ کیا ہے۔

○ مذکورہ صنعتی ادارے کی فیکٹری گدون امیزئی صوبہ سرحد میں اور ہیڈ آفس کراچی میں ہے جبکہ تجارتی ادارے کا ہیڈ آفس نیویارک، امریکہ میں اور برانچ آفس کراچی میں ہے۔

○ ان اداروں نے اضافی سہولت یہ فراہم کی ہے کہ وہ قرآن کالج کے فارغ التحصیل طلبہ کا انٹرویو لینے کے لئے لاہور میں خصوصی انتظام کریں گے۔

○ ملازمت کے خواہش مند تمام فارغ التحصیل طلباء کو ہدایت کی جاتی ہے کہ وہ اپنی درخواست ۱۰ دسمبر ۹۳ء تک مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور کے ناظم اعلیٰ جناب سراج الحق سید صاحب کو ارسال کر دیں۔ درخواست میں اپنا موجودہ پتہ اور رابطے کے لئے ٹیلی فون نمبر ضرور درج کریں تاکہ انٹرویو کی تاریخ سے انہیں مطلع کیا جاسکے۔

KHILAFAT LAHORE
Town Lahore 54700 Regd:No L. 9184

راولپنڈی اور پشاور میں منعقد ہونے والے

امیر تنظیم اسلامی و داعی تحریک خلافت

ڈاکٹر اسرار احمد

کے

خطباتِ خلافت

کا نظام الاوقات :

راولپنڈی : ۶ تا ۸/ دسمبر ۹۳ء' روزانہ بعد نماز مغرب

بمقام : سرسید پبلک سکول ہال' ٹیپو روڈ

نوٹ : اس جلسے کے لئے روزانہ مندرجہ ذیل مقامات سے بسیں چلائی جائیں گی :
کراچی کمپنی' تیج بھانہ' جہاز گراؤنڈ کالونی

پشاور : ۱۳ تا ۱۵/ دسمبر ۹۳ء' بعد نماز مغرب

(مقام کا اعلان اگلے شمارے میں کیا جائے گا)

موضوعات :

☆ موجودہ مایوس کن حالات میں عالمی نظام خلافت کی نوید جانفزا

☆ خلافت کی اصل حقیقت

☆ عہد حاضر میں نظام خلافت کا سیاسی' دستوری اور معاشی و معاشرتی نظام

☆ عہد حاضر میں نظام خلافت کے قیام کا نبوی طریق کار

شرکت کی عام دعوت ہے